علمِ حدیث اور چند اہم محدثین

سالم قدوائی

نذیر سنز پبلشرز
۴۰۔ اے اردو بازار، لاہور

قیمت ۱۱۰/- روپے
باراول جولائی ۱۹۸۲ء
مطبع زاہد بشیر پرنٹرز۔ لاہور

پبلشرز نذیر حسین
نذیر سنز پبلشرز ۴۰۔ اے اردو بازار لاہور

فہرست

مقدمہ

دین و شریعت سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو کچھ منسوب ہو اس کو "حدیث" کہتے ہیں۔ حدیث کا سرچشمہ شعور نبوت ہے جس کی رسائی کا اندازہ دعوت اسلام کے سب سے پہلے حیات بخش خطاب سے ہوتا ہے۔ آپ نے قریش کو جمع کر کے صفا پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو کر فرمایا:

"اے قریش کے لوگو! تم مجھے بتاؤ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکل کر تم پر حملہ کرنے والی ہے تو میری تصدیق کرو گے؟ سب نے بیک زبان ہو کر کہا بے شک۔ ہم نے کبھی آپ سے سوائے سچ کے اور تجربہ نہیں کیا۔"

جس طرح رسول اللہ صلعم صفا کی چوٹی پر کھڑے پہاڑ کی دونوں سمتوں کو دیکھ رہے تھے اسی طرح حقیقت کے کلی ادراک کے بعد شعور نبوت بہت سی ان باتوں کو دیکھتا اور ان اشارات کو پاتا رہتا ہے جن تک رسائی دوسروں کی نہیں ہو سکتی۔ خود رسول اللہ نے اس "رسائی" کو کئی مرتبہ ان الفاظ میں ظاہر فرمایا "انی ارسی مالا ترون" (میں وہ دیکھتا ہوں

جو تم نہیں دیکھتے ہو)

شعور نبوت نے حدیث کو قرآن حکیم کی معنوی دلالت سے حاصل کیا، جس کا طریقہ یہ تھا کہ آپ پر جب آیتیں نازل ہوتیں تو ان کی معنوی دلالت پر غور و فکر کر کے تشریح، تفصیل اور توضیح کا خاکہ تیار کرتے پھر اس کے مطابق ہدایات و تعلیمات کا سلسلہ جاری رہتا یہ دونوں کبھی قولی ہوتیں اور کبھی قولی و عملی دونوں ہوتی تھیں۔

قرآن حکیم دراصل مقاصد، مصالح اور اصول و کلیات ہی کی کتاب ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق جس قدر جزئیات ہیں وہ بطور نمونہ انھیں کی تشریح تفصیل اور توضیح کے لیے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے لیے اخذ و استنباط کا سلسلہ جاری رہے۔ اس اخذ و استنباط کے سب سے پہلے مخاطب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے پھر آپ کے بعد تمام وہ لوگ مخاطب ہیں جو اخذ و استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ رسول اللہ نے شعور نبوت کے ذریعہ اس فریضہ کو انجام دیا اور بعد کے لوگ شعور اجتہاد کے ذریعہ اس فریضہ کو انجام دینے پر مامور ہیں۔

ختم نبوت پر شعور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، لیکن یہ اس وقت ختم ہوا جبکہ شعور اجتہاد اس کی قائم مقامی کے قابل بن گیا۔ یعنی اس میں اس درجہ پختگی، توانائی اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لیے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت نہ رہ گئی (جیسا کہ ختم نبوت سے پہلے رسول اور نبی کے ذریعے آسمانی ہدایت کا انتظار رہتا تھا) بلکہ وہ خود غور و فکر اور تلاش و جستجو سے یہ مسائل حل کرنے لگا۔

لیکن زندگی و معاشرے کا تجربہ رکھنے والے ماہرین و مفکرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ شعور اجتہاد کے فیصلے طبعی خصوصیات و بشری کمزوریوں سے خالص و بے آمیز نہیں ہوتے ہیں۔ اس بنا، پر اس کو آزاد و خود مختار نہیں چھوڑا گیا بلکہ ہر موڑ و ہر موقف پر شعور نبوت کی رہنمائی کو ضروری قرار دیا گیا۔

اس "شعور" سے رہنمائی حاصل کرنے کا براہ راست سلسلہ اگرچہ ختم ہو گیا لیکن اس سے حاصل شدہ سرمایہ حدیث کے نام سے موجود و محفوظ ہے۔ اس سرمائے کے جمع و تدوین میں محدثین نے جس قدر کوششیں اور کاوشیں کی ہیں اس کا اندازہ گولڈ زیہر جیسے متعصب مصنف کے اعتراف سے ہوتا ہے، اس نے لکھا ہے:

"حدیثوں کو جمع کرنے کے لیے محدثین نے اسلامی دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک، اندلس سے وسط ایشیا تک شہر شہر اور گانو گانو کا پیدل سفر کیا تاکہ وہ دوسروں تک منتقل کر سکیں، اس زمانے میں جمع کرنے کی اس سے زیادہ معتبر اور قابل اعتماد صورت نہ تھی۔ رحّال (بہت سفر کرنے والے) اور جوّال (بہت سیر و سیاحت کرنے والے) کے قابلِ فخر القاب دراصل ان اونچے درجے کے لوگوں سے کبھی جدا نہیں ہوئے۔ راہ علم کے ان مسافروں کے لیے طوّاف الاقالیم (ملکوں کا طواف کرنے والے) نہ کسی استعارے پر مبنی ہے اور نہ اس میں کسی طرح کا مبالغہ ہے۔ ان لوگوں نے ان تمام ملکوں کا سفر محض سیر و سیاحت یا تجربہ حاصل

کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ان کا مقصد صرف حدیث کے
جاننے والوں سے ملنا اور ان سے حدیثیں حاصل کرنا تھا
حدیث کی طلب و جستجو میں ان کی مثال اس چڑیا کی تھی جو ہر
درخت (اس کی ہر شاخ) پر اس کی پتیوں سے غذا حاصل
کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھتی ہے۔"[1]

جمع و تدوین کے علاوہ حدیث کی صحیح معرفت کے لیے بھی محدثین نے
تحقیق و تنقید کا ایک معیار مقرر کیا ہے جس کے بعد اس کی معرفت میں
کوئی دشواری نہیں رہتی۔ یہ معیار سند اور متن دونوں سے متعلق ہے۔ متن
اصل حدیث اور سند اس تک پہنچنے کے ذریعے اور راستے کو کہتے ہیں۔ سند کو
جاننے کا تعلق خارجی نقد حدیث اور متن کے جانچنے کا تعلق داخلی نقد حدیث
سے ہے۔ ہر ایک کے اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین اصول حدیث کی
کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

حدیث کی معرفت میں دشواری اس لیے پیش آتی ہے کہ کلام نبوت
(حدیث) کو اسی معیار سے جانچنے کی کوشش ہوتی ہے جو معیار عام لوگوں
کے کلام کو جانچنے کے لیے ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایسی حدیث کا انکار کر دیا جاتا
ہے جس میں کوئی علمی حقیقت بیان ہوئی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے زمانے میں وہ مشہور نہ تھی، یا کوئی حدیث خوشخبری سے متعلق تھی جس کا ابھی
وقت نہ آیا تھا، یا قانونی کلیہ یا حکمت کا اصول بیان ہوا تھا جو اس وقت کی

[1] Muslim Studies by Ignaz Goldziher
(English Translation)
Vol, II, Part VI Talabat Hadith pp 165-166

ذہنی سطح سے بلند تھا اگرچہ بعد میں اس کا رواج ہو گیا ہو وغیرہ، حالانکہ
رسول اللہ صاحب وحی تھے اسرار غیب سے بھی ایک حد تک واقف تھے،
علم و حکمت کی ترویج اور قانون و شریعت کا نفاذ آپ کا خاص مشن تھا
اس لیے آپ نے اگر کوئی بات وقت کی ذہنی سطح سے بلند فرمائی یا قانون
و اصول اس انداز سے بیان کیے کہ بعد میں فلسفہ یا قانونی کلیہ کے مشابہ
قرار پائے تو نہ شانِ نبوت پر حرف آتا ہے اور نہ کسی مقنن و فلسفی سے
متاثر ہونے کا سوال اٹھتا ہے۔

نقد و تحقیق کے سلسلے میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ حدیث کا
سرچشمہ شعور نبوت ہے، اس کو جو خصوصیات اور تحفظات حاصل ہیں وہ
کسی اور کے شعور کو حاصل نہیں ہیں۔ لازمی طور سے شعور نبوت سے نکلی
ہوئی بات (حدیث) عام لوگوں سے ممتاز اور اس کی نقد و تحقیق کا معیار
دوسروں کے معیار سے مختلف ہوگا، ورنہ نبیؐ اور غیر نبی کے کلام میں فرق
و امتیاز نہ قائم رہ سکے گا۔

حدیث اور محدثین کو سمجھنے کے لیے زیر نظر کتاب نہایت اہم ہے، اس
میں تاریخ تدوین حدیث، اصول حدیث، اصطلاحات حدیث اور ائمہ
محدثین کے حالات پر سلیس زبان میں عام فہم گفتگو کی گئی ہے اور محدثین
کی فنی احتیاط اور دیانت داری کو مختلف واقعات کے تحت واضح کیا گیا
ہے۔ مثلاً امام بخاری کے شیخ علی بن مدینیؒ سے ان کے والد کے بارے میں
پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا "دین کا معاملہ ہے، میرے والد ضعیف
راوی ہیں"۔ امام وکیعؒ کے والد سرکاری خزانے کے ذمے دار تھے اس لیے
امام وکیعؒ ان کی کسی ایسی روایت کو نہ تسلیم کرتے تھے جو صرف ان سے مروی

ہو۔ امام ابوداوٗدؒ نے اپنے بیٹے کے بارے میں فرمایا کہ وہ کذاب ہے۔ امام مالکؒ کا بیان ہے کہ مدینہ میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا کرتے تو ان کی دعا کی برکت سے بارش ہوتی لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا اس لیے کہ یہ لوگ زہد و تقویٰ میں تو بے مثال تھے لیکن حدیث و روایت اور فتووں کا کام محض زہد و تقویٰ سے نہیں چل سکتا، اس کے لیے علم و فہم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جس زہد کے ساتھ فہم و فراست اور دانائی نہ ہو وہ علم و فن کے لیے مفید نہیں ہے۔ اس قسم کے واقعات ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں جو ہر معاملے میں کسی ایک فرد کی بات کو حجت تسلیم کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں کوئی کتنا ہی بڑا محقق عالم ہو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ اب علم و تحقیق کی دنیا بڑی وسیع ہو گئی ہے، پہلے ایک فرد کی صلاحیت کافی ہوتی تھی اب تقسیم کار کے بغیر چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ پہلے رہنمائی کی ضرورت ایک معاشرے تک محدود تھی اب اس کا تعلق ایک دور اور زمانے سے ہو گیا ہے، ایسی حالت میں جس طرح کسی ایک فرد سے اپنی تمام ضرورتوں کو وابستہ کرنا ناعاقبت اندیشی ہے اسی طرح کسی فرد کا زندگی کے ہر گوشے میں رہنمائی کا مدعی بننا خود فریبی ہے۔

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی صاحب کے مضامین علمی رسالوں معارف، برہان، اسلام اور عصر جدید، مجلہ علوم اسلامیہ اور رسالہ جامعہ میں شائع ہوتے رہے ہیں، جن سے اہل علم متعارف ہیں۔ ان کی کتاب "ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں" ابھی شائع ہو چکی ہے جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے۔ یہ کتاب بھی انھوں نے بڑی محنت اور تلاش و جستجو کے بعد مرتب کی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ یہ عرصے سے

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اس بنا پر جدید ذہن اور افہام و تفہیم کے طریقوں سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ کتاب اصلاً دینیات یا اسلامک اسٹڈیز کے ان طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے جن کے کورس میں حدیث اور محدثین سے متعلق مضامین شامل ہیں، اسی بنا پر بعض فنی تفصیلات سے قصداً گریز کیا ہے اور اصطلاحات کو نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک مدت سے میری خواہش تھی کہ یونیورسٹی کے طلبہ کے ذہن کے مطابق ان کے کورس کے مضامین پر مشتمل کتابیں مرتب کی جائیں لیکن یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اب یہ کتاب دیکھ کر واقعی بے حد مسرت ہوئی اور مؤلف سلمہٗ کے لیے دل سے دعائیں نکلیں ضرورت ہے کہ اسی طرز پر کورس کے اور مضامین پر بھی کتابیں مرتب کی جائیں۔ اللہ مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور کتاب کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین

محمد تقی امینی
ناظم دینیات
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تاریخ تدوین حدیث

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر انسانوں کی رہنمائی اور اصلاح کے لیے نازل کیا گیا۔ چونکہ یہ ایک مجموعہ قوانین واحکام ہے اور اس سے رہتی دنیا تک لوگوں کو اپنے مسائل کے حل اور نظامِ زندگی و معیشت وحکرانی کے اصول وضوابط مرتب کرنے ہیں اس لیے اس میں اللہ تعالیٰ نے مختصر انداز میں اس وقت اور آئندہ پیش آنے والے تمام حالات اور مواقع کے بنیادی اصول بیان کر دیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلعم پر یہ ذمّے داری ڈالی کہ وہ ان باتوں کو لوگوں کو سمجھائیں اور اپنے عمل سے ذہن نشین کرائیں تاکہ آئندہ لوگوں کے لیے یہ نمونہ بن جائے اور جس بات میں لوگوں کو کچھ سمجھنے میں دقت ہو وہ آپ کے اقوال وافعال کی روشنی میں اسے سمجھ سکیں۔ آپ کے انھی اقوال وافعال کو حدیث کہتے ہیں۔

حدیث کے لغوی معنی بات چیت کے ہیں، لیکن بعد میں اصطلاح میں یہ لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور ایسے واقعات جو

آپ کے سامنے پیش آئے اور آپ نے ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی (جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے حدیث کے مفہوم کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ وہ امور جن کا تعلق کسی بھی طرح حضور سے اور حضور کے زمانے سے ہو۔ گویا حدیث ایک طرح سے رسول اللہ صلعم کے دور کی تاریخ کا نام ہے۔[1]

حدیث کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) قولی: یعنی جو رسول اللہ صلعم نے کہا ہو۔

(۲) فعلی: یعنی جو آپؐ نے کیا ہو۔

(۳) تقریری: یعنی جو بات آپؐ کے سامنے کی گئی اور آپؐ نے اس سے روکا نہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے:

"آپؐ کے یہ اقوال و افعال اور آپؐ کا یہ سکوت ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں جن کی روشنی میں اگر ہم خالق پاک کی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ طے کرنا چاہیں تو منزل مقصود تک پہنچنے میں کچھ بھی شک باقی نہیں رہ جاتا۔ اس راستے پر چلنے والے کے لیے صراطِ مستقیم سے بھٹک جانے کا کوئی خطرہ نہیں، جس نے آنحضرتؐ کی حدیث پر عمل کیا وہ راہ یاب ہوا اور جس نے اس سے منہ پھیرا وہ یقیناً گمراہ ہے اس پر عمل کرنے میں خیر کثیر ہے اور اس پر عمل نہ کرنا خسران مبین ہے۔"[2]

---

[1] تدوین حدیث صفحہ ۱۷ [2] حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۱، صفحہ ۱۲۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال و افعال مسلمانوں کے لیے اسی طرح سے دستور العمل ہیں جس طرح سے کہ قرآن مجید۔ رسول اللہ صلعم نے خود بھی اپنی سنت پر عمل کرنے کی تلقین کی ہے، اور فرمایا ہے: "ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ وسنتی" (میں نے تمھارے پاس دو اہم چیزیں چھوڑی ہیں ایک تو اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی سنت) اور "علیکم سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی" (تمھارے اوپر میری سنت لازم ہے اور جس نے میری سنت سے انحراف کیا وہ مجھ سے نہیں ہے) سچ تو یہ ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے حدیث کی واقفیت بہت ضروری ہے، حدیث قرآن مجید کی تشریح و توضیح ہے اور قرآن و حدیث مل کر اسلام کی محکم عمارت کی بنیادیں ہیں۔ حدیث ایک طرف قرآن کریم کی تفسیر ہے، اس کے اجمال کی تفصیل ہے اس کے احکامات کی تشریح ہے اور اسلام کے ابتدائی دور کی سب سے اہم اور سب سے معتبر تاریخ بھی۔ اگر حدیث کا سرمایہ محفوظ نہ رہا ہوتا تو اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ کے ایک بہت بڑے حصے کو سمجھنے سے بعد کے لوگ قاصر رہتے۔ مثلاً قرآن مجید میں نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ کے اصولوں کا ذکر ہے اس کی تفصیل ہمیں صرف احادیث ہی کے ذریعے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ حکومت کے نظام، سماج کے ضابطے، حلال و حرام کے قواعد اور اوامر و نواہی کا پورا پتہ صرف حدیث ہی سے چلتا ہے۔ رسول اللہؐ کی ابتدائی زندگی، اسلام کی آمد، اس کی تبلیغ، مسلمانوں کی اس راہ میں قربانیاں، اعلاءِ کلمۃ حق کا جذبہ اور اس سلسلے میں کوششیں، غزوات، اسلام کا پھیلنا اور اس کا اثر و رسوخ، اسلامی حکومت کا قیام اور اس کا نظام اور خود حضورؐ کی سیرت مقدسہ کے معلوم کرنے کا سب سے

اہم اور قابل اعتماد ماخذ یہ حدیثیں ہی ہیں۔ اگر ان کو پوری احتیاط، ایمانداری
اور سمجھ بوجھ کے ساتھ محفوظ نہ رکھا گیا ہوتا تو شاید یقیناً اسلام کی بہت
سی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے بے شمار گوشے آج لوگوں کے سامنے
نہ ہوتے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا
مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، جگہ جگہ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آیاتِ قرآنی
کی تشریح و توضیح کریں:

"ہم نے تم پر کتاب اس لیے اُتاری ہے کہ تم ان کے لیے
ان چیزوں کی وضاحت کرو جس میں انھوں نے اختلاف کیا،
اور اس کو ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور
رحمت بنا کر اُتارا۔" (سورۂ نحل - ۸)

ایک اور جگہ پر ہے:

"اور ہم نے تمھاری طرف حق کے ساتھ کتاب اُتاری
تاکہ تم لوگوں کے درمیان جس طرح خدا نے سمجھایا ہے اس طرح
فیصلہ کرو۔" (سورۂ نساء - ۱۶)

رسول اللہ ﷺ کی گفتگو کو من جانب اللہ قرار دیا:

"رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہ وحی ہوتی
ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔" (نجم - ۱)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو نمونہ بنایا گیا ہے:

"لوگو، تمھارے لیے رسول اللہ صلعم کے اندر اچھا

نمونہ ہے۔" (احزاب - ۳)

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا:

"اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم
کیا جائے۔" (آل عمران - ۱۴)

دوسری جگہ ہے:

"آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری
پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو
معاف کر دے گا۔" (آل عمران - ۴)

خود رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

"جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت
کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔"

ایک اور جگہ کہا:

"میں جس چیز سے تم کو منع کروں اس سے رک جاؤ اور
جس چیز کا حکم دوں اس کو اختیار کرو۔"

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقوال و افعال کی اہمیت کو
سمجھتے تھے اور آپ کو یقین تھا کہ یہ باتیں اور یہ اعمال بعد میں آنے والی نسلوں
کے لیے بہت کام کے ہوں گے، اسی لیے آپ نے متعدد بار اپنے اصحاب کو حکم دیا
تھا کہ اس قیمتی سرمائے کو محفوظ کر لیں اور نہ صرف یہ کہ محفوظ کریں بلکہ یہ ذمے
داری بھی عائد کی کہ جو لوگ نہیں وہ دوسروں تک پہنچا بھی دیں۔ حجتہ الوداع
کے خطبے میں آپ کا یہ جملہ: فلیبلغ الشاھد الغائب۔" (جو لوگ موجود
ہیں وہ اُن لوگوں تک ان باتوں کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں) اس کا سبب

ے بڑا ثبوت ہے۔

اس کے علاوہ بھی احفظوہ واخبروہ من ورائکم" (ان باتوں کو یاد کرلو اور جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں ان کو مطلع کرو) یا "ارجعوا الی اھلیکم فعلموھم" (اپنے گھر والوں کے پاس واپس جاؤ اور ان کو سکھاؤ) —— اس قسم کی بہت سی احادیث موجود ہیں۔

اسلام کے ابتدائی دور ہی سے جو لوگ مسلمان ہوتے تھے وہ رسول اللہ صلعم سے غیر معمولی محبت اور مذہب سے بے حد تعلق محسوس کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ دنیاوی عیش و عشرت کے سامان کے مقابلے میں ان کو اللہ سے تعلق اور رسولؐ سے قرب زیادہ محبوب تھا۔ ایک مرتبہ کلمہ توحید پڑھنے کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک دوسری ہی دنیا اور ایک نئے عالم میں پاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے الگ ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ یہ لوگ حضور کی محبت اور جذبۂ عقیدت سے اس قدر سرشار ہوتے تھے کہ آپ کی ایک ایک بات کو بغور دیکھتے اور سنتے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے۔ ان لوگوں کی تمنا ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزاریں اور آپ کی تعلیمات کو یاد رکھیں۔ جوں جوں اسلام کا حلقہ بڑھتا گیا۔ آپ کی تعلیمات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ جہاں چند لوگوں کو صرف چند مسائل درپیش ہوتے تھے وہاں سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے مسائل اسی مناسبت سے بڑھ گئے اور احادیث کا سلسلہ بھی پھیلتا گیا۔ آپ کے صحابہ ہر اس بات کو اسی طرح سے کرنے کی کوشش کرتے جس طرح سے آپ فرماتے یا عمل کرتے اور ان کی یہ تمنا ہوتی تھی کہ وہ ایمان و یقین اور علم و عمل کے اسی رنگ میں رنگ جائیں جو اللہ اور رسولؐ کو مرغوب تھا۔ اس طرح سے بہت سے صحابہ

رسول اللہ کی زندگی کا عملی نمونہ بن گئے تھے، اور یہ تدوین حدیث کی پہلی شکل تھی جو پوری طرح سے محفوظ اور قابلِ اعتماد تھی۔

ابتدا میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات میں جلد جلد تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا، مذہب کا جذبہ اور ایمان کا جوش بہت بڑھا ہوا تھا، ایک طرف قرآن مجید نازل ہو رہا تھا دوسری طرف لوگوں کو مسائل کی فکر تھی۔ ان حالات میں حضورؐ کا یہ خیال تھا کہ اگر لوگ آپ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے تمام الفاظ قلمبند کرنے لگے تو ممکن ہے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ آپ کے الفاظ بھی لکھ لیں اور آئندہ یہ دونوں چیزیں خلط ملط ہو جائیں، اس لیے شروع میں آپ نے حکم دیا تھا کہ مجھ سے قرآن مجید کے سوا اور کچھ نہ لکھو۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب آپ کو یقین ہو گیا کہ قرآن مجید کے بہت سے حافظ ہو گئے ہیں جو کلام اللہ اور اقوال رسولؐ میں تفریق کر سکتے ہیں، نئے مسلمان ہونے والوں کی تعلیم و تربیت کا نظام بن گیا ہے، اصحاب صفہ کی جماعت تعلیم دین کے حصول میں لگ گئی ہے، تو یہ خطرہ بڑی حد تک دور ہو گیا۔ پھر آپ نے اس بات کی عام اجازت دے دی کہ میں جو کچھ بھی کہوں یا میری زبان سے جو کچھ بھی نکلے اس کو لکھ لو، اس لیے کہ اس منہ سے جو بھی نکلتا ہے وہ حق ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ جو بھی فرماتے ہیں مجھے اچھا لگتا ہے لیکن یاد نہیں رہتا، آپ نے فرمایا اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو (یعنی لکھ لیا کرو) [1]

---

[1] حدیث کی کتابوں میں یہ سب تفصیلات موجود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں آپ کے صحابہ کو آپ کی باتیں لکھنے کا شوق ہو گیا تھا، اور بہت سے صحابہ کے پاس حدیثوں کا تحریری سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے تھے کہ میں آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے جو بھی سنتا حفظ کرنے کے خیال سے قلمبند کر لیتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے علاوہ مجھ سے زیادہ حدیثوں کو روایت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیثوں کا یہ مجموعہ ایک ضخیم کتاب کی شکل میں تیار ہو گیا تھا جس کا نام انھوں نے صادقہ رکھا تھا، ان کو اپنے اس مجموعے سے بہت محبت تھی اور اسے عزیز رکھتے تھے، فرماتے تھے: "صادقہ ایک صحیفہ ہے جو میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھا"۔[2]

حضرت عبداللہ بن عمرو اس کو بڑی اہمیت دیتے تھے، کہا کرتے تھے: "دو چیزوں کی وجہ سے مجھے زندگی عزیز ہے، ایک تو صحیفہ صادقہ کی وجہ سے اور دوسرے الوہط نامی اراضی کی بنا پر جو مجھے میرے والد نے عطا کی تھی"۔[3] ان کے انتقال کے بعد یہ نسخہ وراثتاً ان کے خاندان میں چلتا رہا، مسند احمد بن حنبل میں یہ جوں کا توں محفوظ کر لیا گیا ہے۔[4] یہ صحیفہ اور اس سے متعلق

۱۔ بخاری، کتابۃ العلم
۲۔ تقیید العلم ص۸۴ بحوالہ علوم الحدیث ص۴۵ صبحی صالح
۳۔ علوم الحدیث ص۴۵
۴۔ ایضاً ص۴۵

حضرت ابو ہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی روایت سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی کتابت حدیث کا کام شروع ہو گیا تھا۔

حضرت زید بن ثابتؓ کے رسول اکرمؐ سے تقرب کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کاتب وحی تھے، بڑے بڑے صحابہ ان کی ثقاہت اور دیانت داری کے قائل تھے، لیکن وہ کتابت حدیث کے قائل نہ تھے، ایک مرتبہ کسی نے ان کی روایات قلمبند کیں جب ان کو معلوم ہوا تو ضائع کرا دیا۔ بالآخر مروان نے ان سے حدیثیں سُنانے کی فرمائش کی۔ ایک پردہ ڈلوایا اور اس کے پیچھے ایک آدمی کو حدیث لکھنے کے لیے مقرر کیا۔ حضرت زید حدیث بیان کرتے اور پردے کے پیچھے وہ آدمی لکھتا جاتا۔ اس طرح سے ان کی حدیثیں بھی جمع ہو گئیں جو بہت اہمیت رکھتی ہیں۔[1]

حضرت علیؓ نے بھی بہت سی حدیثیں لکھ لی تھیں، ان کا یہ مجموعہ چمڑے کے تھیلے میں ان کے ساتھ رہتا تھا، وہ کہتے تھے کہ ہم نے رسول اللہ صلعم سے اس صحیفے اور قرآن کے علاوہ کچھ نہیں سیکھا۔ اس صحیفے کو خود رسول اکرم صلعم نے لکھوایا تھا، اس میں زکوٰۃ، خوں بہا، اسیروں کی رہائی، کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہ کرنا، حرم مدینہ کے حدود اور اس کی حرمت، غیر کی طرف انتساب کی ممانعت، نقض عہد کی بُرائی، غیر کے نام پر ذبح کرنے پر وعید وغیرہ بہت سے احکام و مسائل درج تھے۔ حدیث کی اکثر کتابوں میں اس صحیفے کی روایتیں موجود ہیں۔[2]

۱۔ مسلمان اور وقت کے تقاضے ص۱۱۳ ۲۔ ابن ماجہ اور علم حدیث ص۱۴۲

حضرت رافع بن خدیج رضؓ کو خود رسول اللہ صلعم نے اجازت دی تھی کہ وہ حدیثوں کو لکھ لیا کریں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کی بہت سی احادیث کو قلمبند کر رکھا تھا اور ضرورت کے وقت لوگوں کو اس سے احکام و معلومات فراہم کرتے تھے[1]

حضرت انس رضؓ رسول اللہ صلعم سے خاصے قریب تھے، اکثر آپ کے ساتھ رہتے تھے، انھوں نے بھی حدیثوں کی ایک بڑی تعداد جمع کر رکھی تھی، لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے حدیثیں نقل کرتے تھے۔ جب لوگ ان سے احادیث و مسائل کے بارے میں پوچھتے تو وہ ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلعم سے سنی ہیں اور ان کو لکھ کر حضور کے سامنے پیش بھی کر چکا ہوں۔ اس مجموعے کی بہت سی حدیثیں بخاری میں موجود ہیں۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضؓ نے بھی بہت سی حدیثوں کو جمع کر لیا تھا، خاص طور سے حج کے متعلق انھوں نے ایک کتاب جمع کی تھی، ان کے شاگرد وہب بن منبہ نے ان کی بیان کردہ حدیثوں کو ایک مجموعے کی شکل میں جمع کر دیا تھا۔

حضرت عائشہ رضؓ کی جلالت، شان اور علم و فضل سے بڑے بڑے فقہا متاثر تھے، اور مشکل مسائل میں ان سے مدد لیتے تھے، ان کی روایات سے حدیثوں کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، ان کی حدیثوں کو بھی ان کے بھانجے اور شاگرد عروہ بن زبیر نے جمع کر دیا تھا۔ عورتوں میں حضرت عائشہ رضؓ نے حدیثوں کی سب سے بڑی تعداد بیان کی ہے۔ حضرت عروہ رضؓ کا نسخہ غالباً ضائع ہو گیا، لیکن بعض

---

[1] مسند احمد بن حنبل

دوسرے ذرائع سے یہ حدیثیں اور لوگوں کے پاس محفوظ تھیں جس کی نقلیں حضرت عمر بن عبد العزیز نے تیار کرائیں[1]۔ حضرت عمرہ بنت عبد الرحمٰن رحؒ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رضؓ دونوں حضرت عائشہ رضؓ کے شاگرد تھے اور ان کی روایات کے سب سے بڑے عالم، ان کی روایات کو بھی جمع کیا گیا۔[2]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضؓ جن کی شہرت مفسر قرآن کی حیثیت سے ہے ان کے متعلق روایت ہے کہ آنحضرت صلعم کے غلام رافع رضؓ سے حضورؐ کی باتیں سن کر لکھا کرتے تھے، مختلف صحابہ کے گھروں پر جا کر بڑی محنت و جانفشانی سے حضورؐ کی ایک ایک بات معلوم کرتے[3]

امام ترمذی نے لکھا ہے کہ طائف کے کچھ لوگ ان کے پاس ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے ان کو پڑھا[4]۔ ان کے شاگردوں نے حدیث کی نشر و اشاعت میں بہت حصہ لیا، ان کی مجلس میں بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے، جب کاغذ ختم ہو جاتا تو چمڑے پر لکھتے۔ سفر کی حالت میں کچھ نہ ملتا تو کجاوے کی لکڑی پر لکھتے۔

حضرت ابو ہریرہ رضؓ نے حدیثوں کے حفظ و ضبط میں بہت محنت و جانفشانی سے کام لیا۔ آنحضرت کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے، ایک ایک بات غور سے سنتے اور اسے یاد رکھتے، انھوں نے رات کے تین حصے کیے تھے۔ ایک میں سوتے دوسرے میں عبادت کرتے اور تیسرے

---

[1] تدوین حدیث ص۹۹ — [2] علوم الحدیث ص۶۶
[3] تذکرۃ الحفاظ
[4] تدوین حدیث ص۷

میں حدیثیں یاد کرتے ۔ شروع میں حدیثوں کو نہ لکھتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے اپنی تمام مرویات کو تحریری طور پر محفوظ کرلیا تھا، جب کسی قسم کا شک و شبہ پیدا ہوتا تو اس مجموعے سے اس کی تصدیق کرتے ۔

عمرو بن امیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضؓ کے سامنے ایک حدیث پر گفتگو ہوئی تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور ہمیں احادیث کی کتابیں دکھائیں اور کہا دیکھو وہ حدیث میرے پاس لکھی ہوئی ہے [1]

حضرت ابو بکر رضؓ نے بھی حدیثیں جمع کی تھیں مگر پھر انھیں جلا دیا اس خیال سے کہ مبادا اس میں بعض ایسی احادیث بھی ہوں جو آپ کو اچھی طرح سے یاد نہ رہی ہوں [2] اور بھی بہت سے دوسرے صحابہ نے اپنے ورع و تقویٰ کی بنا پر لکھی ہوئی حدیثیں ضائع کر دیں کہ ممکن ہے انھوں نے کوئی بات غلطی سے لکھ لی ہو۔

حضرت سمرۃ بن جندب رضؓ کے پاس حدیثوں کا تحریری سرمایہ تھا جو ان کے بعد ان کے بیٹے سلیمان کے پاس رہا، حضرت حسن بصری رحؒ اور سلیمان بن سمرۃ نے اس صحیفے سے بہت سی روایات نقل کی ہیں [3]

حضرت عبداللہ بن مسعود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص تعلق تھا خدمت مبارک میں اس قدر حاضر رہتے تھے کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ گھر کے فرد ہیں ۔ ابتدا میں کتابت حدیث کے قائل نہ تھے لیکن بعد میں خود بھی لکھتے اور شاگردوں کو بھی لکھاتے، انھوں نے بھی حدیثیں کتابی شکل میں جمع

---

[1] فتح الباری، ج ۱ ص ۲۱۷ ، ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۴۴

[2] تذکرۃ الحفاظ [3] ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۴۴

کی تھیں جو ان کے بیٹے عبدالرحمٰن کے پاس محفوظ تھی ۔ حضرت سعد بن عبادہ رضؓ نے بھی ایک مجموعۂ احادیث مرتب کیا تھا جو کئی پشت تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا، اس کی روایات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں ۔ سعد بن ربیع رضؓ کے پاس بھی لکھی ہوئی حدیثیں موجود تھیں، عبداللہ بن ابی ربیعہ رضؓ اسلمی کے پاس بھی احادیث محفوظ تھیں ۔ ابو موسیٰ اشعری بھی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے، مغیرہ بن شعبہ رضؓ، براء بن عازب رضؓ، عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضؓ وغیرہ بھی حدیثیں لکھتے اور جمع کرتے تھے [1]

حدیثوں کے اس تحریری سرمائے کے علاوہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معاہدات، صلحنامے، احکامات اور خطوط وغیرہ بھی لکھے ہوئے موجود تھے مثلاً صلح حدیبیہ کا معاہدہ، شاہان مصر و روم و ایران کے نام آپ کے خطوط، فتح مکہ کے بعد آپ نے جو خطبہ دیا تھا ابو شاہ یمنی کی درخواست پر انھیں لکھوا دیا تھا۔ زکوٰۃ و صدقات سے متعلق احکامات ابو بکر بن حزم والیٔ بحرین کو لکھوائے تھے۔ یہ احکامات بعض دوسرے امراء کو بھی بھیجے گئے تھے ۔ حاکم یمن عمرو بن حزم کو تقرری کے وقت ایک تحریر لکھائی تھی جس میں فرائض، صدقات، طلاق، صلوٰۃ وغیرہ سے متعلق ضروری احکامات تھے ۔

عبداللہ بن حکیم کے پاس بھی آپ کی طرف سے ایک تحریر تھی جس میں مردہ جانوروں سے متعلق احکام تھے ۔ وائل بن حجر کو نماز، روزہ، سود اور شراب وغیرہ سے متعلق ضروری باتیں لکھوائی تھیں ۔ حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو یمن ایک تحریر بھجوائی تھی جس میں سبزیوں وغیرہ پر زکوٰۃ نہ لینے کا حکم تھا ۔ ان تمام

---

[1] مقدمہ معارف المشکوٰۃ ص ۱۵

باتوں کا ذکر بخاری، ابوداؤد، مسند احمد بن حنبل، دارقطنی اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں موجود ہے۔

جس طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگوں کو حدیثیں لکھنے اور جمع کرنے کا شوق تھا۔ اسی طرح سے صحابہ کرام کے دور میں بھی لوگوں کی دلچسپی اس فن کو آگے بڑھانے میں رہی، جو لوگ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں چھوٹے بچے تھے یا بعد میں پیدا ہوئے تھے ان کو قدرتی طور پر اپنے رسولؐ کے حالات جاننے اور ان کی باتیں سننے کا شوق تھا، اس لیے یہ لوگ بزرگ صحابیوں کے پاس جمع رہتے اور ان سے حدیثیں سُن سُن کر لکھ لیتے، بعد میں یہ مجموعے بڑی اہمیت کے حامل ہوئے اور حدیثوں کی حفاظت و اشاعت کا بڑا ذریعہ بنے۔

بشیر بن نہیک (تابعی) حضرت ابوہریرہؓ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، جو بھی حدیث سنتے لکھ لیتے، جب ان سے رخصت ہونے لگے تو اس کتاب کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام حدیثیں پڑھ کر سنائیں پھر ان سے پوچھا کہ میں نے جو کچھ آپ کو سنایا وہ سب آپ نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے۔ انھوں نے جواب دیا ہاں۔[1]

ہمام بن منبہ یمانی حضرت ابوہریرہؓ کے خاص شاگرد تھے، حضرت ابوہریرہؓ نے حدیثوں کا ایک مجموعہ ان کے لیے مرتب کیا تھا، یہ مجموعہ ہمام کی روایت سے پورا کا پورا محفوظ ہوگیا، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو اس صحیفے کے دو مخطوطے ایک برلن میں اور دوسرا دمشق میں ملا، ان دونوں میں ذرا بھی

[1] دارمی ص۶۸ طحاوی ص۳۸۵، ج ۲

فرق نہیں ہے، اس میں ۱۳۸ حدیثیں ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ اس صحیفے کی تمام احادیث احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں روایت کی ہیں اور صحیحین میں بھی اس کی روایتیں موجود ہیں۔[1]

سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ میں رات کو حضرت عبد اللہ بن عباس کے ہمرکاب ہوتا وہ مجھ سے کوئی حدیث بیان کرتے تو لکھ لیتا تھا، ان لوگوں کے علاوہ عبد اللہ بن عقیل، ابان، عبد اللہ بن حنش، حسن بن جابر، ابو بردہ اشعری وغیرہ اصحاب رسولؐ سے سُن کر حدیثیں لکھتے اور ان کی اشاعت کا اہتمام کرتے۔

عہد صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور حفظ حدیث کا ویسا ہی انتظام کیا گیا جیسا کہ قرآن کریم کا تھا۔ بچوں کو جس طرح قرآن مجید یاد کرایا جاتا اسی طرح سے حدیثوں کو بھی زبانی یاد کراتے۔ ان حدیثوں کو اس طرح زبانی یاد کرانے کے بعد یہ لوگ اسے دُہراتے بھی رہتے تھے۔ تاکہ حافظے میں موجود رہے۔ اسی کے ساتھ چونکہ اب لکھنے کا فن عام ہو گیا تھا اور وسائل بھی نسبتاً زیادہ میسر تھے اس لیے حدیثیں باقاعدہ فن کی شکل میں مرتب ہونے لگی تھیں۔ بعد میں علما نے حفاظ حدیث کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے زمانے میں حدیث کے حافظ کہے جاتے تھے۔ ان میں چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

۱۔ اسماء الحفاظ — از حافظ ابوالولید یوسف بن عبد العزیز اندلسی ۵۴۶ھ

۲۔ اخبار الحفاظ — ،، علامہ ابن جوزی ۵۹۷ھ

[1] تدوین حدیث حاشیہ ص۹۹ علوم الحدیث ص۵۱ تا ۵۲

۳۔ کتاب اربعین الطبقات	از شرف الدین ابوالحسن علی بن المفضل	۶۱۱ھ
۴۔ طبقات الحفاظ	ر شیخ الاسلام تقی الدین	۷۰۲ھ
۵۔ تذکرۃ الحفاظ	ر حافظ شمس الدین ذہبی	۷۴۸ھ
۶۔ ذیل تذکرۃ الحفاظ	ر ابوالمحاسن حسینی دمشقی	۷۶۵ھ
۷۔ طبقات الحفاظ	ر حافظ ابن حجر عسقلانی	۸۵۲ھ
۸۔ طبقات الحفاظ	ر حافظ جلال الدین سیوطی	۹۱۱ھ

ان کتابوں کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں اسی سلسلے میں لکھی گئیں لیکن وہ یا تو انھی کتابوں سے ماخوذ ہیں یا پھر انھی کا اضافہ و تکملہ۔ چونکہ قدیم زمانہ میں حافظے کی قوت لوگوں میں زیادہ تھی اور تحریر کو بھی حفظ کی کسوٹی پر پرکھے بغیر تسلیم نہ کرتے تھے اس لیے حدیث ہی کو نہیں دوسرے علوم کو بھی لوگ سینہ بسینہ منتقل کرتے رہتے تھے لیکن جب اسلام عرب کے حدود سے نکل کر دور دور علاقوں میں پھیلنے لگا تو اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اختلافات کو بچانے کے لیے رسول اللہ صلعم کے اقوال و افعال کو باضابطہ تحریری طور پر مرتب و مدون کر دیا جانا چاہیے تاکہ ان کی حفاظت ہو جائے۔ اس کے علاوہ چونکہ رسول اللہ صلعم کے اصحاب بھی رفتہ رفتہ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اس لیے یہ خیال بھی ہونے لگا تھا کہ اب کھرے کھوٹے کی گرفت کون کرے گا۔ صحابہ کرام کی موجودگی میں جھوٹی روایات کے عام ہونے کا زیادہ خطرہ نہ تھا' لوگوں کو یہ اطمینان تھا کہ اگر کوئی بھی ایسی گڑھی ہوئی حدیث بیان کی گئی تو یہ حضرات اسے غلط ثابت کر دیں گے۔ لیکن جب صحابہ کے مبارک وجود سے دنیا خالی ہونے لگی تو حدیثوں کو مدون کرنے کی ضرورت کا

احساس شدت سے پیدا ہوا۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:

"یہ وہ قابل قدر علم ہے جو اس قابل ہے کہ اس کی تحصیل و تکمیل میں عمر عزیز کو بے دریغ صرف کیا جائے۔۔۔ اس علم کا حاصل کرنا انسان کے لیے آخرت کا عمدہ ترین ذخیرہ ہے اور اسی کی بدولت آدمی کو دین میں بصیرت حاصل ہوتی ہے۔"[1]

جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے اس وقت تک صحابہ تقریباً اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ اہم اہم تابعین بھی ختم ہوتے جا رہے تھے' اس لیے آپ کو یہ فکر ہوئی کہ ان بزرگوں کی رحلت سے کہیں علوم شرعیہ میں اختلافات نہ ہونے لگیں اور حدیثوں کی جو امانت ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہے غائب نہ ہو جائے' آپ نے اسی خیال سے مختلف شہروں اور علاقوں کے حکام کے نام فرمان جاری کیے کہ حدیث نبوی کو تلاش کر کے جمع کر لیا جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ بھی لکھا کہ احادیث نبویہ کے ساتھ ساتھ خلفاء راشدین کے آثار کو بھی جمع کر لیا جائے تاکہ احکام و فرامین رسول پر کس طرح سے عملدرآمد ہوا اس کی مثال بھی موجود رہے۔ اس سلسلے میں آپ نے مدینہ منورہ کے عامل ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو بھی ایک خط لکھا جس میں مذکورہ بالا حکم کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمن اور قاسم بن محمد[2] سے جو روایات بھی ملے اسے لکھ لیا جائے۔ ابوبکر بن محمد نے

[1] حجۃ اللہ البالغۃ ج ا ص ۱۲۳
[2] یہ دونوں حضرت عائشہ کے شاگرد اور ان کی روایات کے سب سے بڑے عالم تھے اور حدیث و فقہ میں ماہر تھے۔

خلیفہ کے حکم کے مطابق حدیث کی روایات کو جمع کیا، لیکن قبل اس کے کہ یہ کتابیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کو بھیجی جاتیں ان کا انتقال ہوگیا۔[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خط کا اثر جن لوگوں نے قبول کیا ان میں حجاز و شام کے مشہور عالم محمد بن مسلم بن شہاب زہری مدنی (۱۲۴ھ) بھی تھے، انھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ یہ کام کیا اور حدیث کی ایک کتاب مرتب کی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کی نقلیں تیار کرا کے اپنی حکومت کے مختلف علاقوں میں بھجوائیں، امام زہری اپنی اس کوشش کے سلسلے میں کہا کرتے تھے:

"اس علم کو میری طرح مجھ سے پہلے کسی نے بھی مدون نہیں کیا"۔[2]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدینے میں حدیث کی باقاعدہ تدوین کی اولیت کا سہرا امام زہری کے سر ہے۔ امام زہری شروع میں کتابت حدیث کے قائل نہ تھے، لیکن پھر کچھ تو اُمرائے وقت کے مجبور کرنے سے اور کچھ حدیث رسول کے مٹ جانے کے ڈر اور موضوع احادیث کے پھیل جانے کے خطرے سے حدیثوں کو لکھنے اور ان کی نشر و اشاعت کے پوری طرح سے قائل ہو گئے تھے۔ لیکن حضرت عُمر بن عبدالعزیز کا مقصد یہ نہ تھا کہ صرف کسی ایک علاقے میں تدوین حدیث کا کام ہو، آپ نے جو فرمان جاری کیا تھا وہ مختلف علاقوں میں بھیجا گیا تھا اور

[1] علوم الحدیث ص۶۲، ابن ماجہ اور علم حدیث ص۱۵۵

[2] علوم الحدیث ص۶۲

ان علاقوں میں بھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا، اس وقت مدینے میں سعید بن المسیب، کوفے میں امام شعبی، بصرہ میں حسن بصری اور شام میں مکحول جیسے عالم موجود تھے، ان لوگوں نے احادیث کی جمع و تدوین اور اشاعت میں بڑا حصہ لیا، ان کے شاگردوں نے ان سے حدیثوں کو سیکھا، لکھا اور دوسروں تک پہنچایا۔

صحابہ کے بعد تابعین، ان کے بعد تبع تابعین نے حدیثوں کی تلاش و جستجو اور تدوین کا کام جاری رکھا۔ ابن شہاب زہری، ہشام بن عروہ، قیس بن ابی حازم، عطاء بن ابی رباح، سعید بن جبیر وغیرہ سیکڑوں تابعین کے اسمار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو ایک ایک سے پوچھ پوچھ کر، ہر دروازے پر جاکر بوڑھے، جوان، مرد، عورت سب سے تحقیق کر کے احادیث جمع کرتے۔ مدینہ منورہ چونکہ ابتدار اسلام میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور رسول اللہ صلعم نے صحابہ کرام کے ساتھ یہاں اپنی زندگی کے اہم ترین دن گزارے تھے، یہاں کے لوگ رسول اکرم کی زندگی کے گوشے گوشے سے واقف تھے، اس لیے قدرتی طور پر یہاں حدیث کا جتنا بڑا خزانہ موجود تھا دوسری جگہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس علم کے پیاسے مدینے ہی کی طرف بھاگتے تھے، تدوین حدیث کے ابتدائی مراحل یہیں طے ہوئے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ پھیلنے لگا، بہت سے وہ صحابی اور کبار تابعین جو مدینے سے باہر چلے گئے تھے لوگ ان کے پاس جاکر علم حدیث حاصل کرنے لگے۔ یہ شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ تلاشِ حدیث کے لیے دور دراز کے سفر کی تکلیفیں اُٹھانا ان لوگوں کی تمنا بن گئی تھی۔

"ان میں سے جو عظیم القدر علما تھے انھوں نے طلب حدیث کے لیے اور اس میں تبحر حاصل کرنے کی غرض سے بلاد حجاز، ملک شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کا سفر کیا۔ کتب حدیث کو متعدد شیوخ و اساتذہ سے حاصل کیا، مختلف نسخے حدیث کے تلاش کیے اور غرائب الحدیث اور نوادر آثار کے جمع کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔۔۔۔ ان کی کوششوں سے احادیث و آثار کا ایک عظیم الشان ذخیرہ جمع ہو گیا جو پہلے کبھی جمع نہیں ہوا تھا۔"[1]

سعید بن المسیب ایک ایک حدیث کی تلاش میں کئی راتیں اور کئی دن مسلسل سفر کرتے تھے۔ ابو قلابہ تین دن مدینہ میں صرف اس لیے ٹھہرے کہ وہ کسی سے ایک حدیث سننا چاہتے تھے۔ مکحول ایک حدیث کی تلاش کے لیے حجاز، عراق، شام اور مصر گئے۔[2] ان کے علم و فضل کے ان کے ہمعصر معترف تھے، امام اوزاعی ان کے شاگرد تھے۔

امام زہری کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ انھوں نے بڑی محنت و کاوش سے اقوال و حالاتِ رسول اللہ صلعم جمع کیے۔ وہ مدینہ منورہ کے تمام گھروں پر جاتے اور ایک ایک سے تفصیلی حالات پوچھتے اور جمع کرتے۔ احمد بن موسیٰ جو عبدان کے نام سے مشہور تھے اٹھارہ مرتبہ مصر گئے تاکہ ایوب بن کیسان سے حدیثیں سن سکیں۔[3] بہت سے لوگوں

---

[1] حجۃ البالغۃ ج ۱ ص ۱۴۱ [2] علوم الحدیث ص ۴۴، ۴۶، ۴۷
[3] علوم الحدیث ص ۴۸

کو الگ مضامین کی احادیث جمع کرنے کا شوق ہوتا تھا، علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ امام شعبی نے ایک مضمون کی حدیثوں کو جمع کرنے کا کام سب سے پہلے کیا، اس طرح سے تبویب احادیث کے بانی آپ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ ابتدا میں کتابت حدیث کے قائل نہ تھے مگر حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم کو پورا کرنے کی غرض سے یہ کام کیا۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ کوفہ میں قاضی تھے اور اس دور میں ان سے زیادہ علم حدیث کا جاننے والا کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔[1]

غرض اس طرح سے اور بھی بہت سے لوگوں کے متعلق تذکروں میں لکھا ہے کہ دور دراز کے سفر کر کے احادیث کو جمع کرتے تھے، بہت سے لوگ ذوق و شوق میں پیدل ہی سفر کرتے تھے: کبھی کبھی یہ سلسلہ بچپن ہی سے شروع ہو جاتا تھا اور راہ کی تکالیف ان لوگوں کے لیے لذت آمیز ہوتی تھیں۔ رجال کی کتابوں میں ایسے لوگوں کے ذوق و شوق کی بہت تعریف ملتی ہے اور ان کے سفروں اور اس سلسلے کے مصائب کا ذکر خاص طور سے ہوتا ہے اور اس سے ان کی حیثیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اکثر محدثین نے ایک ہی حدیث کی تلاش میں بہت سی جگہوں کے سفر کیے، اس سے حدیث کے الفاظ کی ہم آہنگی و ہم رنگی میں بڑی مدد ملی اور تضاد و اختلاف دور ہوا، ساتھ ہی ساتھ راویوں کی چھان بین بھی ہوتی رہی۔ غرض اس طرح سے مختلف زمانوں میں حدیث کا سرمایہ سینوں سے نکل کر سفینوں

---

[1] ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۵۷

میں محفوظ ہونے لگا۔

بہرحال پہلی صدی کے آخر میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے باقاعدہ سرکاری طور پر تدوین حدیث کا دروازہ کھلا۔ اب تک جو لوگ ذاتی طور پر اس علمی کام کو انجام دیتے تھے اب خلیفۂ وقت کے حکم سے اسی کام میں لگ گئے اور دوسری صدی ہجری میں اس سلسلے کو اتنی ترقی ہوئی کہ احادیثِ رسولؐ کے ساتھ ساتھ آثار صحابہ اور تابعین کبار کے فتاویٰ کو بھی مدون کر دیا گیا۔ مسلمانوں میں احادیث کی جمع و تدوین کے تین دور ہیں:

(۱) جب ہر شخص نے اپنی ذاتی معلومات کو جمع کیا۔ یہ دور لگ بھگ سنہ ۱۰۰ھ تک رہا، یہ دور صحابہ اور اکابر تابعین کا تھا۔

(۲) اس دور میں مختلف شہروں کی معلومات کو یکجا کیا گیا، یہ دور سنہ ۱۵۰ھ تک رہا، یہ دور تبع تابعین کا تھا۔

(۳) اس دور میں تمام دنیائے اسلام کی حدیثوں کی تدوین ہوئی اور موجودہ کتب احادیث مرتب کی گئیں، یہ دور تیسری صدی ہجری تک رہا، یہ دور اصحاب صحاح کا تھا۔

پہلے دور کا تمام تر سرمایہ دوسرے دور کی کتابوں میں جمع ہوا، اور دوسرے دور کا پورا مواد تیسرے دور کی کتابوں میں پھیلا دیا گیا اور یہی تمام سرمایہ آج ہزاروں اوراق میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا کی تاریخ کا سب سے قیمتی اور معتبر و مستند ذخیرہ تسلیم کیا جاتا ہے[1]

---

[1] خطبات مدراس ص ۶۰

حدیثِ نبوی کے سلسلے میں ہر دور میں بے شمار کتابیں علما اپنے اپنے ذوق اور نقطۂ نظر کے مطابق جمع کرتے رہے۔ ان میں سے کچھ کتابیں شائع ہوئیں اور لوگ ان سے روشناس ہوئے لیکن بہت سی کتابیں غیر مطبوعہ رہیں، جن میں سے کچھ ضائع ہو گئیں اور کچھ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں اور اہلِ علم کے خاندانوں میں ذاتی ملکیت کے طور پر پڑی ہیں۔ حدیث کی یہ تمام کتابیں جو مختلف زمانوں میں مرتب ہوئیں علمانے ان کو مختلف طبقات و مراتب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا طبقہ اس میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک ہیں۔ ان میں متواتر، صحیح اور حسن حدیثیں ہیں اور ان سے احکام شریعت کا استنباط کیا جاتا ہے۔

دوسرا طبقہ اس میں سنن ابی داؤد، مسند احمد بن حنبل، سنن نسائی اور ابن ماجہ و جامع ترمذی شامل ہیں۔ اس طبقے کی حدیثیں پہلے طبقے سے قدرے کم درجے کی ہیں، ان کو قبولِ عام کی سند ملی ہے اور ان سے بہت سے علوم و احکام کا استخراج کیا گیا ہے۔ اس طبقے کی حدیثیں بھی مسائل شرعیہ کے لیے سند کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

تیسرا طبقہ اس میں وہ کتب حدیث شامل ہیں جن میں ضعیف حدیثیں پائی جاتی ہیں اور ان کے اکثر راویوں کا حال پوری طرح سے معلوم نہیں ہے۔ مثلاً: مسند ابن ابی شیبہ، مسند طیالسی، طبرانی و طحاوی وغیرہ۔ ان کتابوں سے صرف وہ علمائے حدیث فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو فنِ حدیث سے پوری طرح واقف ہوں اور اسماء الرجال کی روشنی میں ان کے کھرے کھوٹے کو پرکھ سکتے ہوں۔

چوتھا طبقہ اس طبقے میں وہ کتابیں شامل ہیں جس میں ضعیف روایات بکثرت ہیں اور زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ عام طور سے یہ افسانہ گو واعظوں، مورخین اور غیر ثقہ بدعتی لوگوں سے سن کر لکھی گئی ہیں، ان میں ابن مَردَوَیہ، ابن شاہین اور ابوالشیخ کی تصانیف ہیں، علمائے حدیث اس طبقے کی کتابوں کو مستند نہیں سمجھتے۔

حدیث کی سب سے اہم اور مشہور کتابیں چھ ہیں، ان کی صحت کی وجہ سے ان کو صحاحِ ستّہ کہا جاتا ہے، یہ کتابیں ہیں:

۱۔ بخاری	۲۔ مسلم	۳۔ ابوداؤد
۴۔ ترمذی	۵۔ نسائی	۶۔ ابن ماجہ

ان سب کا تفصیلی ذکر آیندہ اوراق میں کیا جائے گا۔

اصولِ حدیث

جیساکہ کتاب کے شروع میں بیان ہوچکا ہے، علمِ حدیث مسلمانوں میں علمِ قرآن کے بعد سب سے اہم علم ہے، یہ ایک طرح سے قرآن کی تشریح اور اس کی تکمیل ہے، مسلمانوں نے اس کی حفاظت اسی طرح سے کی جس طرح سے کہ قرآن مجید کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث کی طرف توجہ زیادہ رہی تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ قرآن مجید کی تدوین تو ایک بار ہوگئی اور ہمیشہ کے لیے ہوگئی۔ اب اس کی تفسیر اور اس کے اصول وضوابط میں تو بحث ہوسکتی ہے لیکن اس کی ترتیب وتدوین وغیرہ سے متعلق جو کچھ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوگیا اس میں کسی قسم کی جدّت یا ردّوبدل نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی ضرورت کبھی محسوس ہوئی اور نہ ہوگی۔ لیکن فنِ حدیث کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ اس کو کسی ایک انداز پر مدوّن کردیا جاتا۔ اس میں تو رسول اللہ صلعم اور اسلام کی

ابتدائی تاریخ کے ساتھ حکومت، سماج، مذہب اور دنیا کے بے شمار
مسائل کا تذکرہ ہے جس کی تحدید کوئی بہت آسان کام نہ تھا مسلمانوں
نے اس کی حفاظت اور تدوین کے لیے جس سوجھ بوجھ، ذمے داری اور
لگن کے ساتھ کام کیا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔
یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ مسلمانوں نے اپنے رسولؐ کے ایک ایک قول
اور ایک ایک عمل کو نہ صرف پوری طرح محفوظ رکھا بلکہ دوسروں
تک پہنچایا بھی۔

راویوں کی جرح و تعدیل کا کام اگرچہ شروع ہی سے ہو رہا تھا
لیکن تیسری صدی ہجری میں علمائے حدیث نے اس فن کو باضابطہ
مدون کیا، حدیث کا جتنا بھی سرمایہ جن ذرائع سے بھی ممکن تھا جمع
کیا گیا، اس کے بعد ان کی صحت کو پرکھنے کی طرف توجہ ہوئی اور
اسماء الرجال کا فن ایجاد ہوا۔ صحابہ کے دور میں حدیثوں کو بیان
کرنے والے وہی لوگ تھے جنھوں نے خود حضور اکرمؐ کو دیکھا تھا یا
ساتھ رہے تھے، اور چونکہ رسول اللہ صلعم کا بار بار یہ اعلان تھا
کہ جو شخص میری طرف جھوٹ بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے،
اس لیے صحابہ بڑی احتیاط کرتے تھے اور پوری طرح اطمینان کیے بغیر
رسول صلعم کی طرف کوئی بات منسوب نہ کرتے تھے۔ اس کے بعد تابعین کے دور میں وہ
لوگ تھے جنھوں نے صحابہ کو دیکھا اور ان سے حدیث روایت کی۔

اپنے زمانے کے متعلق آپؐ نے فرمایا تھا: "سب سے بہتر میرا
زمانہ ہے۔"

ایک اور جگہ آپؐ نے فرمایا:

"وہ آدمی خوش نصیب ہے جس نے مجھے دیکھا اور
مجھ پر ایمان لایا۔"

اپنے اصحاب کرام کے متعلق آپ نے فرمایا:

"میرے ساتھی ستاروں کی طرح سے ہیں، ان میں
سے تم جس کی بھی اقتدا کرو سیدھے راستے پر پہنچو گے۔"

اور یہی وجہ تھی کہ صحابہ کے متعلق یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ:

"الصحابۃ کلھم عدول" (صحابہ سب کے سب
معتبر ہیں۔)

اس لیے ان پر جھوٹی حدیث بیان کرنے کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا
ان صحابہ سے معتبر تابعین نے جو روایات بیان کیں وہ عام طور سے
صحیح تسلیم کی گئیں۔ البتہ اس کے بعد جو دور آیا اس میں چونکہ اسلام
دور دراز کے علاقوں تک پہنچ گیا تھا اور لوگ رسول اکرمؐ کی باتوں
کو اپنے اپنے الفاظ اور طریقوں سے بیان کرنے لگے تھے اس لیے
عقائد میں فتور پیدا ہونے کا خطرہ ہو گیا تھا، اور اس بات کا اندیشہ
تھا کہ مختلف لوگوں اور مختلف ذریعوں سے بیان کی ہوئی روایت
میں حدیث کے علاوہ دوسری باتیں نہ شامل ہو جائیں۔ اسی کے
ساتھ ساتھ یہودیوں اور مسلمانوں کے دوسرے مخالفین سے اس
بات کا خطرہ تھا کہ وہ اس کے الفاظ و مفہوم میں الٹ پھیر کرنے
لگیں، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ بہت سے ایسے کذاب پیدا ہو گئے
تھے جنھوں نے من گھڑت حدیثیں بیان کرنا شروع کر دی تھیں، اس
لیے علمائے حدیث نے اسماء الرجال کے فن کی طرف توجہ کی جس کا مقصد

یہ تھا کہ حدیث بیان کرنے والے تمام اشخاص کے تفصیلی حالات جمع کر دیے جائیں۔ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا کہ ہر روایت کی سند میں جتنے بھی نام آئیں ان میں سے ہر ایک کے حالات کو یکجا کیا جائے، اور حالات میں بھی صرف یہ نہیں کہ کیا نام تھا، کہاں پیدا ہوئے، باپ کون تھے وغیرہ بلکہ یہ باتیں کہ وہ کس قسم کے انسان تھے، کیا کرتے تھے، چال چلن کیسا تھا، کھانے پینے میں کس قسم کی چیزیں استعمال کرتے تھے، رہن سہن کیسا تھا، ملنے جلنے اور ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے کیسے تھے، سمجھ بوجھ کیسی تھی، سماج میں ان کا کیا مرتبہ تھا، تعلیم و تربیت کس ماحول میں اور کیسی ہوئی تھی، ذہن اور حافظہ کیسا تھا، کس قبیلے اور کس خاندان سے تعلق تھا، تحصیل علم کے لیے کہاں کہاں گئے، اساتذہ کون کون تھے، غرض یہ کہ انسان کی زندگی کی پوری تفصیل اس فن کے تحت جمع کی جاتی تھی۔ اس وقت جب تذکرہ نویسی اور تاریخ کا فن پوری طرح سے رائج نہ تھا یہ کام کتنا مشکل اور صبر آزما رہا ہوگا۔ محدثین راویوں کے حالات کی تحقیق کے لیے دور دراز کے سفر کرتے، لوگوں سے مل کر حالات معلوم کرتے، خود اس شخص سے مل کر اس کے ذاتی حالات کے متعلق سوال در سوال کرتے اور ایک ایک بات کو نوٹ کرتے۔ محدثین نے اپنی عمریں اس کام کے لیے وقف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے اور ذاتی تحقیقات کی بنیاد پر اسماء الرجال کا فن مرتب کیا۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے:

"کوئی قوم دُنیا میں ایسی نہیں گزری، نہ آج موجود ہے جس نے مُسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص

کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"[1]

بہرحال اس فن کی ایجاد کے بعد یہ کام آسان ہوگیا کہ راویوں کی روایت کی جانچ پڑتال کی جاسکے۔ فن جرح و تعدیل رواۃ کی اسی چھان بین اور جانچ پڑتال کا نام ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے صحابہ کے زمانے ہی سے اس فن کی ابتدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس (۹۶ھ) اور حضرت انس بن مالک (۹۳ھ) اس دور میں، تابعین کے دور میں امام شعبی (۱۰۴ھ) ابن سیرین (۱۱۰ھ) شعبہ (۱۶۰ھ) امام مالک (۱۷۹ھ) اس کے بعد کے دور میں ابن مبارک (۱۸۱ھ) ابن عیینہ (۱۹۷ھ) یحییٰ بن سعید قطان (۱۹۸ھ) وغیرہ اس فن کے امام ہیں۔[2]

علامہ طاہر جزائری لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے سب سے پہلے (یحییٰ بن سعید قطان کے بعد) فن جرح و تعدیل پر تالیف کی اور کلام کیا۔ اس طبقے میں یحییٰ بن معین (۲۲۱ھ) احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) اور محمد بن سعد کاتب الواقدی اور صاحب الطبقات (ابن سعد زہری ۲۳۰ھ) اور علی بن المدینی (۲۳۴ھ) ہیں۔ ان کے بعد امام بخاری، امام مسلم، ابوذرعہ، رازی، ابوحاتم، ابو داؤد سجستانی آئے۔ ان حضرات کے بعد بکثرت

---

[1] بحوالہ خطبات مدراس صـ ۴۴

[2] علوم الحدیث صـ ۱۴۴

لوگوں نے طبقہ بعد طبقہ ساتویں صدی ہجری کے اواخر تک رجال پر کتابیں تالیف کیں اور اس پر بحث کی، اور اس کا اہتمام کیا یہاں تک کہ کتب حدیث میں کوئی راوی ایسا نہیں ہے کہ ان حضرات کی تالیفات میں اس کی تاریخ بسہولت نہ مل سکے"[۱]

محدثین نے راویوں کے حالات کی چھان بین اور کھرے کھوٹے کو الگ کرنے میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہ لیا۔ امیر و غریب، چھوٹے بڑے اور باپ بیٹے کسی کو بھی مستثنیٰ قرار نہ دیا گیا، اگر قابل تنقید تھا تو پوری طرح سے تنقید کی گئی، اگر ثقہ تھا تو اس کے دلائل پیش کیے گئے۔ امام بخاری کے شیخ علی بن مدینی سے ان کے والد کے سلسلے میں اصرار سے پوچھا گیا تو جواب دیا، دین کا معاملہ ہے، میرے والد ضعیف راوی ہیں، امام وکیع کے والد سرکاری خزانے کے ذمے دار تھے اس لیے امام وکیع ان کی کسی ایسی روایت کو تسلیم نہ کرتے تھے جو صرف ان سے مروی ہو۔ امام ابوداؤد نے اپنے بیٹے کے بارے میں فرمایا کہ وہ کذاب ہے[۲]۔ محدثین نے ایسے لوگوں کی روایات کے بارے میں بھی تشدد سے کام لیا ہے جو سڑکوں پر سیر و تفریح کرتے، بازاروں میں کھاتے پیتے، ہنسی مذاق میں حد سے بڑھ جاتے تھے[۳]۔ اس قسم کے بے شمار واقعات موجود ہیں جو اس

---

[۱] فن اسماء الرجال ص۴۴ بحوالہ توجیہ النظر ص۱۱۱

[۲] فن اسماء الرجال ص۴۶ بحوالہ فتح المغیث ص۱۸۴۱

[۳] علوم الحدیث ص۱۰۳ بحوالہ الکفایہ ص۱۱۱

فن میں احتیاط اور دیانت داری کی نمایاں مثال ہیں۔

محدثین کرام نے حدیث کے متن اور سند دونوں کو جانچنے کے لیے ایسے اصول و ضوابط بنا دیے ہیں جن سے کھرے اور کھوٹے کو پوری طرح سے الگ کیا جا سکتا ہے، کچھ ایسی علامات بھی متعین کیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی پائی جائے تو حدیث کو قبول نہ کیا جائے گا۔ مثلاً:

۱۔ جو حدیث وقارِ نبوی کے خلاف ہو۔

۲۔ نص قرآنی یا حدیث متواتر کے خلاف ہو۔

۳۔ خلافِ عقل ہو۔

۴۔ مشاہدات کے مطابق نہ ہو۔

۵۔ جس حدیث میں معمولی نیکی پر بڑے امورِ خیر کے برابر ثواب کا وعدہ ہو، یا معمولی گناہ پر شدید عذاب کی وعید ہو۔

۶۔ کوئی ایسا واقعہ جس کے بہت سے راوی ہو سکتے تھے مگر صرف ایک ہی شخص اس کو بیان کر رہا ہو۔ وغیرہ

اسی طرح سے کسی راوی کی روایت کو قبول کرنے کے لیے اس میں چار باتوں کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) عقل (۲) ضبط

(۳) عدل (۴) اسلام

۱۔ محدثین کی اصطلاح میں عام طور سے عقل سے مراد تمیز و شعور ہے، حدیث کو سمجھنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے بالغ ہونا بھی ضروری ہے، البتہ بعض علما نے اس کی اجازت

دی ہے کہ اگر کوئی بچہ بہت سمجھ دار ہو تو وہ حدیث تو اخذ کر سکتا ہے مگر روایت نہیں کر سکتا۔ بعض محدثین نے روایت حدیث کے لیے تیرہ یا پندرہ سال کی عمر کی قید لگائی ہے۔

۲۔ ضبط سے مراد یہ ہے کہ حدیث کو اچھی طرح سے سُنا اور سمجھا ہو، اور اس طرح سے ذہن نشین کیا ہو کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے، اور سننے کے وقت سے لے کر روایت کرنے کے وقت تک اس میں کوئی فرق نہ ہوا ہو۔ گویا ضبط کے لیے قوتِ حافظہ بنیادی شرط ہے۔

۳۔ عدل سے مراد ہے کہ راوی دینی معاملات میں پختہ ہو، فسق و فجور، غیر اخلاقی و غیر شرعی معاملات سے الگ ہو۔ کسی شخص کے عدل کا پتا عام طور سے اس کے اعمال و افعال اور معاملات کی آزمائش کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ محدثین نے اس سلسلے میں بھی پوری دیانت داری کے ساتھ راویوں کے عدل کی تحقیق کی اور انھی لوگوں کی روایتوں کو قابلِ قبول سمجھا جو اپنے ایمان میں ہر طرح سے مستحکم تھے۔

۴۔ آخری شرط اسلام قدرتی طور پر لازمی ہے، اس لیے کہ راوی احادیث کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، احادیث چونکہ امورِ شرعیہ کی تشریح و توضیح ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان کو بیان کرنے والا خود بھی ان کی اہمیت اور مذہبی حیثیت سے پوری طرح واقف ہو، اسی لیے احتیاط کا تقاضا ہے

کہ وہ مسلم ہو تاکہ سمجھ بوجھ کر روایت کر سکے۔

اسی طرح سے ان لوگوں کی روایت قبول نہ ہوگی جن کا:

۱۔ راوی جھوٹا ہو اور اس کا جھوٹ ثابت ہو چکا ہو۔

۲۔ راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات ثابت نہ ہو یا جس جگہ جا کر سننے کا ذکر ہے وہاں گیا ہی نہ ہو یا اس کی وفات کے بعد پیدا ہوا ہو۔

۳۔ جن لوگوں کے اخلاق میں کسی قسم کی معمولی سی خامی بھی پائی گئی ہو۔

۴۔ جو لوگ عام گفتگو میں سچ نہ بولتے ہوں وغیرہ۔

علوم الحدیث اور فن اسماء الرجال کے سلسلے میں، بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں اس سے متعلق تمام باتوں پر پوری طرح سے بحث کی گئی ہے، اور تمام راویوں کے حالات کو جمع کر دیا گیا ہے، ان میں سے چند کا ذکر درج ذیل ہے:

۱۔ ابن سعد زہری بصری (۲۳۰ھ) نے طبقات ابن سعد مرتب کی، بہت جامع کتاب ہے، اس میں سیرۃ نبویہ کے بعد کے حالات صحابہ و تابعین سے لے کر اپنے دور تک کے علما کے حالات لکھے ہیں، یہ کتاب پندرہ جلدوں میں ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) نے الجرح والتعدیل مرتب کی۔

۳۔ امام بخاری (۲۵۶ھ) نے تاریخ الکبیر مرتب کی، اس کی ترتیب حروف معجم کے اعتبار سے ہے، عہد صحابہ سے

اپنے دور تک کے لوگوں کے حالات لکھے ہیں۔ یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوئی۔

۴۔ عبدالرحمن بن ابوحاتم رازی (۳۲۷ھ) نے الجرح والتعدیل کے نام سے کتاب لکھی جس میں اس فن سے متعلق اہم ائمہ کے اقوال کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی حیدر آباد سے شائع ہوئی۔

۵۔ ابو یوسف عمر بن عبدالبر (۴۶۳ھ) نے الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لکھی، مصنف کا خیال تھا کہ اس میں ان تمام صحابہ کے حالات ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے کی کتابوں میں آگیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، بہت سے صحابہ کے حالات رہ گئے ہیں۔ اسی لیے بعد میں بہت سے علما نے اس کی تکمیل کی غرض سے اس کے ذیل لکھے جن میں ابن فتحون اندلسی (۵۱۷ھ) کا ذیل مشہور ہے۔

۶۔ عزالدین ابن الاثیر (۶۳۰ھ) نے اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ لکھی، اس میں ۷۵۵۴ لوگوں کے حالات ہیں، اس میں صحابہ کے علاوہ بعض دوسرے راویوں کا ذکر بھی آگیا ہے۔

۷۔ حافظ شمس الدین ذہبی (۷۴۸ھ) نے اس سلسلے میں کئی کام کیے: (۱) تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر والاعلام (۲) تذکرۃ الحفاظ (۳) میزان الاعتدال پہلی اور دوسری کتابیں لوگوں کے حالات میں بڑی مستند

سمجھی جاتی ہیں۔ تیسری کتاب فن جرح وتعدیل کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

۸۔ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) نے متعدد کتابیں علم حدیث سے متعلق مرتب کیں۔ (۱) الاصابہ فی تمیز الصحابہ بڑی جامع اور مستند تصنیف ہے۔ اس میں ۹۴۷۷ صحابیوں اور ۱۵۴۵ صحابیات کے حالات ملتے ہیں۔ (۲) لسان المیزان اس میں علامہ ذہبی کی میزان الاعتدال پر اضافے کیے ہیں (۳) تہذیب التہذیب یہ بھی مستند سمجھی جاتی ہے۔

۹۔ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نے طبقات الحفاظ کے نام سے حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ کی تلخیص کی اور کہیں کہیں اضافے بھی کیے۔ ان کا دوسرا اہم کام ابن حجر عسقلانی کی الاصابہ کی تلخیص بھی ہے جو عین الاصابۃ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تیسری ایک اور اہم تصنیف تدریب الراوی ہے۔

۱۰۔ خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) کا شمار حفاظ حدیث اور مورخین میں ہوتا ہے، انھوں نے حدیث کے سلسلے میں بہت سے اہم کام کیے ہیں۔ الکفایہ فی علم الدرایۃ اس فن کی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

۱۱۔ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (۴۰۵ھ) علم حدیث کے بڑے ماہر تھے ان کی "مستدرک" بہت مشہور ہے۔ انھوں نے

معرفۃ علوم الحدیث بھی لکھی ہے۔

۱۲۔ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل (۷۷۴ھ) ابن کثیر کے نام سے مشہور ہیں، اچھے حافظ، فقیہہ اور مورخ تھے اصول حدیث کے سلسلے میں ان کی اختصار علوم الحدیث بہت مشہور ہے۔

اصطلاحات حدیث

بنیادی طور پر حدیث کی دو قسمیں ہیں:

(۱) مقبول: حدیث صحیح کو کہتے ہیں۔

(۲) مردود: حدیث ضعیف کو کہتے ہیں۔

لیکن محدثین نے تین قسمیں متعین کی ہیں جن کے تحت حدیث کی بے شمار قسمیں بنتی ہیں، جن کا تعلق حدیث کے راویوں اور متن دونوں سے ہے:

(۱) صحیح (۲) حسن (۳) ضعیف

یوں تو علمائے حدیث نے حدیث کی سو تک قسمیں بیان کی ہیں۔ ذیل میں اہم اصطلاحات و اقسام حدیث بیان کی جا رہی ہیں[1]۔

۱۔ حدیث: حدیث کے لغوی معنی بات یا گفتگو کے ہیں، لیکن

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علوم الحدیث ص۱۸۱ تا ص۳۶۶

اصطلاح میں رسول اللہ صلعم کے اقوال و عمل اور تقریر کو
حدیث کہتے ہیں۔

۲۔ **صحابی**: صحابی اُس شخص کو کہتے ہیں جس نے بہ حالتِ ایمان
رسول اللہ صلعم سے ملاقات کی ہو اور ایمان ہی کی حالت میں
اس کا انتقال ہوا ہو۔

۳۔ **تابعی**: وہ شخص جو ایمان کی حالت میں کسی صحابی سے ملا ہو
اور ایمان ہی کی حالت میں انتقال ہوا ہو۔

۴۔ **تبع تابعی**: جس نے بہ حالتِ ایمان کسی تابعی سے ملاقات
کی ہو اور ایمان ہی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا ہو۔

۵۔ **اثر**: صحابہ کرام کے قول و عمل کو اثر کہا جاتا ہے۔

۶۔ **سند**: حدیث بیان کرنے والوں کے سلسلے کو سند کہتے ہیں۔

۷۔ **متن**: حدیث کی اصل عبارت کو متن کہتے ہیں۔

۸۔ **حدیثِ قدسی**: جس حدیث کو رسول اللہ صلعم نے اللہ تعالیٰ
کی جانب منسوب کر کے بیان فرمایا ہو۔

۹۔ **مرفوع**: جس حدیث کی روایت کا سلسلہ رسول اللہ صلعم تک
پہنچتا ہو، یعنی آپ کے قول و فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

۱۰۔ **موقوف**: جس حدیث کی روایت کا سلسلہ صحابی پر ختم ہوتا ہو،
یعنی جس میں صحابہ کرام کے اقوال و افعال وغیرہ کا ذکر ہو۔

۱۱۔ **مقطوع**: جس حدیث کی روایت کا سلسلہ تابعی پر ختم ہوتا ہو،
یعنی تابعی کے قول و فعل وغیرہ کا ذکر ہو۔

۱۲۔ **متصل**: جس حدیث کے سلسلۂ روایت یعنی سند میں کوئی

راوی ساقط نہ ہو۔

۱۳۔ **منقطع**: وہ حدیث جس کے سلسلۂ روایت میں کوئی راوی ساقط
ہو یا اس میں کسی مبہم راوی (جس کے حالات زیادہ نہ معلوم
ہوں) کا ذکر کیا گیا ہو۔

۱۴۔ **معضل**: جس حدیث کے سلسلۂ سند میں دو یا دو سے زیادہ
راوی ایک ہی جگہ سے چھوٹ گئے ہوں۔

۱۵۔ **معلق**: جس حدیث کی سند کے شروع سے ایک یا متعدد راوی
چھوڑ دیے گئے ہوں یا پوری سند ہی بیان نہ کی گئی ہو۔

۱۶۔ **مرسل**: جس حدیث میں تابعی صحابی کا نام نہ لے اور حضور
سے روایت کرے۔

۱۷۔ **مضطرب**: حدیث کی سند یا متن میں کمی زیادتی یا نام و عبارت
اُلٹ پلٹ گئے ہوں۔

۱۸۔ **مدرج**: اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں پہلی وہ جس کی سند
میں تغیّر و تبدل ہوا ہو اسے مدرج الاسناد کہتے ہیں۔ دوسری
وہ جس کے متن میں راوی اپنا یا کسی اور کا کلام شامل کرے
اسے مدرج المتن کہتے ہیں۔

۱۹۔ **شاذ**: وہ حدیث جس میں ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ راوی
کی مخالفت کرے۔

۲۰۔ **محفوظ**: وہ حدیث جس کا راوی ثقہ ہو لیکن اس کی مخالفت
اس سے کم درجے کا ثقہ راوی کرتا ہو۔ (یعنی شاذ کا اُلٹا)

۲۱۔ **منکر**: وہ حدیث جس کا زیادہ ضعیف راوی کم ضعیف راوی

کی مخالفت کرتا ہو۔

۲۲۔ **معروف:** وہ حدیث جس میں کم ضعیف راوی زیادہ ضعیف راوی کی مخالفت کرے۔

۲۳۔ **صحیح:** وہ حدیث جس کی سند متصل ہو، جس کے راوی عادل اور قابل اعتماد ہوں، راوی کا حافظہ اور ذہن اچھا ہو، غیر شاذ اور غیر معلل ہو۔

۲۴۔ **حسن:** وہ روایت جس میں صحیح کی تمام شرائط پوری ہوں سوائے حافظہ یا ضبط کے، لیکن اس کی تائید دوسری روایت سے ہوتی ہو۔

۲۵۔ **ضعیف:** ایسی حدیث جس میں صحیح حدیث کی تمام یا بعض شرائط پوری نہ ہوتی ہوں۔

۲۶۔ **موضوع:** وہ حدیث جو کسی راوی نے اپنی طرف سے بنائی ہو یا جس کے سلسلۂ روایت میں کوئی ایسا راوی ہو جس کے بارے میں حدیث کا وضع کرنا ثابت ہو۔

۲۷۔ **متروک:** جس حدیث کی سند میں کوئی راوی جھوٹا ہو یا اس کے کسی قول و فعل کی وجہ سے اس پر فسق کا الزام عائد ہوا ہو۔

۲۸۔ **متواتر:** وہ حدیث جس کے راوی ہر دور میں اتنی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہوں کہ ان سب کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو۔ اس کی دو قسمیں کی جاتی ہیں:

(۱) **متواتر لفظی:** وہ حدیث جس کو تمام راویوں نے ایک

ہی قسم کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہو۔

(۲) **متواتر معنوی:** اس میں حدیث کے الفاظ کا یکساں ہونا شرط نہیں ہے بلکہ مفہوم ایک ہی ہونا چاہیے۔

۲۹۔ **مشہور:** وہ حدیث جس کے راوی کسی بھی دور میں تین سے کم نہ ہوں۔

۳۰۔ **عزیز:** وہ حدیث جس کے راوی ہر دور میں دو سے کم نہ ہوں۔

۳۱۔ **غریب:** وہ حدیث جس کے سلسلۂ روایت میں کسی دور میں ایک ہی راوی ہو۔

۳۲۔ **مقبول:** ایسی حدیث جسے ائمۂ حدیث نے ہر اعتبار سے قابلِ حجت تسلیم کیا ہو۔

۳۳۔ **مردود:** وہ حدیث جسے ائمۂ حدیث نے قابلِ حجت نہ مانا ہو۔

۳۴۔ **مدلس:** راوی جس سے روایت کرے اس سے ملا تو ہو مگر جو حدیث بیان کر رہا ہو، وہ براہ راست اس سے نہ سنی ہو لیکن الفاظ ایسے استعمال کرے جس سے شبہ ہو کہ اس نے براہ راست سنا ہے۔

۳۵۔ **معلل:** اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں کسی ایسی علت کا پتا چلے جس سے حدیث میں قدح وارد ہوتی ہو۔

۳۶۔ **مقلوب:** اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں کسی راوی سے

اصل متن کا کوئی لفظ یا سند میں کسی راوی کا نام بدل گیا ہو یا مقدم موخر ہو۔ قلب سند اور متن دونوں میں پایا جاتا ہو۔

۳۷۔ **معنعن** : اس روایت کو کہتے ہیں جس میں "فلان عن فلان" کے الفاظ سے روایت کی گئی ہو۔

۳۸۔ **مسلسل** : وہ حدیث جس کی سند متصل ہو، اس میں تدلیس نہ ہو، اور کسی ایک خاص عبارت یا فعل کی تکرار ہو، یعنی تمام راوی کسی صفت، حالت یا کیفیت کے بیان کرنے میں یک زبان ہوں۔

۳۹۔ **سند عالی** : وہ حدیث جس کے راوی قلتِ تعداد کے باوجود رسول اللہ صلعم سے قریب تر ہوں اور اسی حدیث کی کسی دوسری سند میں راویوں کی تعداد اس سے زیادہ ہو۔

امام ابو حنیفہ رح

ولادت ۸۰ھ - وفات ۱۵۰ھ

ان کا نام نعمان کنیت ابو حنیفہ اور لقب امام اعظم ہے، ان کی پیدایش کوفہ کے ایک متمول گھرانے میں ۸۰ھ میں ہوئی۔ ان کا سلسلۂ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے۔ نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان۔ بعض لوگوں نے آپ کے دادا کا نام زوطی لکھا ہے جو بنی تمیم کے غلام تھے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ خطیب بغدادی نے امام صاحب کے پوتے اسماعیل کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم اہلِ فارس ہیں اور ہمیشہ سے آزاد ہیں۔ ہمارے خاندان میں کبھی غلامی نہیں آئی۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ کے دادا کا نام اسلام لانے سے پہلے زوطی تھا لیکن جب مسلمان ہو گئے تو ان کا نام نعمان رکھا گیا۔ اسماعیل ہی کی یہ روایت بھی ہے کہ جب امام صاحب کے والد پیدا ہوئے تو ان کے والد ان کو حضرت علیؓ کے پاس لے

گئے۔ حضرت علیؓ نے ان کے حق میں دعائے خیر کی[1]

بہرحال اس پر سب متفق ہیں کہ امام صاحب عجمی النسل تھے، امام صاحب کے والد ثابت کے حالاتِ زندگی کا ٹھیک سے پتا نہیں چلتا، لوگوں کا خیال ہے کہ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ امام صاحب کی پیدائش کے وقت چند صحابہ موجود تھے۔ انس بن مالکؓ رسول اکرم صلعم کے خاص خادم تھے، ان کا انتقال ۹۳ھ میں ہوا۔ سہل بن سعدؓ نے ۹۱ھ میں وفات پائی، ابوطفیل عامر بن واثلہؓ ۱۰۰ھ تک زندہ رہے۔ چونکہ امام صاحب نے بعض صحابیوں کو دیکھا تھا۔ خاص طور سے حضرت انسؓ کو کئی بار دیکھا تھا اسی وجہ سے امام صاحب کو تابعین میں شمار کیا جاتا ہے لیکن یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ امام صاحب نے ان صحابیوں سے حدیث کیوں نہیں روایت کی۔ جو لوگ امام صاحب کے زیادہ طرفدار ہیں، انھوں نے کچھ حدیثیں ایسی جمع کی ہیں جو امام صاحب نے صحابہ سے روایت کی ہیں لیکن یہ حدیثیں عام طور سے بہت ضعیف ہیں۔ صحابہ سے روایت نہ کرنے کی وجہ بعض لوگوں نے یہ لکھی ہے، جو قرین قیاس بھی ہے کہ امام صاحب زمانے کے دستور کے مطابق اپنے والد کے ساتھ تجارت میں لگ گئے تھے لیکن امام شعبی کے توجہ دلانے پر علم حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اس وقت صحابہ میں سے کوئی بھی باقی نہ تھا۔

آپ کی کنیت ابوحنیفہ آپ کے نام سے زیادہ مشہور ہے، حنیفہ

---

[1] سیرۃ النعمان۔ ج ۱۔ ص ۱۶

امام صاحب کی کسی اولاد کا نام نہ تھا، بلکہ یہ کنیت وصفی اور معنوی ہے جس کا مطلب ہے باطل کو چھوڑ کر حق کو اختیار کرنے والا۔ بعض لوگوں نے امام صاحب کی پیدائش کے سلسلے میں رسول اللہ صلعم کی بشارت کا ذکر کیا ہے، مگر وہ حدیثیں صحیح نہیں ہیں۔ بچپن ہی سے امام صاحب اپنے والد کے ساتھ تجارت میں لگ گئے، تعلیم ضروری قسم کی حاصل کر لی تھی۔ ایک روز تجارت ہی کے کام سے کسی سوداگر کے پاس جا رہے تھے، راستے میں امام شعبی کا مکان تھا، امام شعبی اس وقت کوفہ کے اہم عالم اور امام تھے۔ ان کی نظر ابوحنیفہ پر پڑی تو ان کو اپنے پاس بلایا اور علما کی مجلسوں میں بیٹھنے کی تاکید کی اور یہ بھی کہا کہ مجھے تمھارے چہرے پر علم و فضل کے جوہر نظر آ رہے ہیں[1]۔

امام شعبی کی اس گفتگو نے امام ابوحنیفہ پر بہت اثر کیا اور انھوں نے علما کی مجلسوں میں شرکت اور حصولِ علم کی طرف پوری توجہ کی۔ شروع میں آپ کی توجہ علم کلام کی طرف زیادہ تھی اور اس میں جلد ہی کمال حاصل کر لیا، مختلف فلسفیانہ گروہوں سے مناظرے، بحثیں اور گفتگو کی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ان کو خیال آیا کہ یہ سب بہت مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ اگر یہ علم ضروری رہا ہوتا تو صحابہ کرام نے جو دین کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھتے تھے ضرور ایسی بحثوں میں حصہ لیا ہوتا۔ انھوں نے تو صرف فقہی اور دینی مسائل

---

[1] سیرۃ النعمان۔ ج ۱۔ ص ۲۷

کی طرف توجہ دی اور اسی کو بہتر طریقے پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔
اس خیال کے آتے ہی انھوں نے کلامی علوم کو چھوڑ کر فقہی مسائل کی
طرف توجہ کی اور امام حماد (م ۱۲۰ھ) کی مجلس میں حاضر ہوکر شرعی
علوم کی تعلیم حاصل کی۔[۱]

حماد کوفہ کے مشہور امام اور عالم تھے۔ انھوں نے حضرت انس رضؓ
سے حدیث سنی تھی، امام ابو حنیفہ چونکہ بہت ذہین اور اچھے حافظے
کے مالک تھے اس لیے بہت جلد استاد کے عزیز ترین شاگرد
بن گئے، اور یہ تعلق اتنا بڑھ گیا کہ جب استاد کو سفر پر جانا ہوتا تو لائق
شاگرد کی یاد بے چین رکھتی اور کہتے کہ اگر مجھے قدرت ہوتی کہ میں ابو حنیفہ
سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا۔[۲]

اسی زمانے کا ایک اور واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ
عرصے تک امام حماد کے درس میں رہنے کے بعد ان کو یہ خیال ہوا کہ
اپنا حلقہ درس شروع کریں لیکن استاد کا ادب مانع ہوتا تھا، اتفاق
سے امام حماد کو بصرہ جانا پڑا، چلتے وقت وہ امام ابو حنیفہ کو اپنا جانشین
بنا گئے۔ اُستاد کی عدم موجودگی میں انھوں نے ساٹھ مسائل میں فتوے
دیے۔ جب امام حماد واپس آئے تو انھوں نے وہ مسائل اور اپنے فتوے
ان کے سامنے پیش کیے۔ امام حماد نے ان میں سے بیس میں غلطیاں
نکالیں۔ امام ابو حنیفہ کو ان کی عظمت کا احساس ہوا اور قسم کھائی کہ

۱ امام اعظم اور علم حدیث ص۱۱۸
۲ امام اعظم اور علم حدیث ص۱۲۵

جب تک امام حماد زندہ ہیں ان کی شاگردی نہ چھوڑیں گے۔[۱]

امام حماد کے علاوہ ان کے اور بھی بہت سے اساتذہ تھے، جن
میں سے مشہور یہ تھے، امام شعبی، عطاء بن رباح، علقمہ بن مرثد، حکم
بن عتبہ، سلمہ بن کہیل، علی بن احمر، سعید بن مسروق ثوری، عدی
بن ثابت، یحییٰ بن سعید انصاری، ہشام بن عروہ، نافع، قتادہ
ابو اسحٰق اور عمرو بن دینار وغیرہ۔ بہت سے لوگوں نے ان کے اساتذہ
کی تعداد سیکڑوں سے بھی اوپر شمار کی ہے۔ اسی طرح سے ان کے
شاگردوں کی تعداد کا بھی صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، لیکن ان
کے تین شاگرد امام محمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام زفرؒ غیر معمولی طور پر
مشہور ہوئے اور امام صاحب کی فقہ کو، جو فقہ حنفی کے نام سے مشہور
ہے، پھیلانے اور اس کا سکہ بٹھانے میں پیش پیش رہے۔ یہ انھیں
کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج فقہ حنفی مسلمانوں کے بہت بڑے طبقے
میں رائج ہے۔

امام صاحب جس طرح سے علم وفضل میں بے مثل تھے اسی طرح
سے اخلاق وکردار میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ تذکروں اور تاریخ کی
کتابوں میں بہت سے واقعات کا ذکر ملتا ہے، ایک مرتبہ ہارون
رشید نے امام ابو یوسف سے ابو حنیفہ کے اوصاف پوچھے تو انھوں
نے بیان کیا کہ:

"امام محارم سے اجتناب کرتے تھے، بغیر علم کے

۱ سیرۃ النعمان، ج ۱، ص۳۲

دین کے سلسلے میں کوئی بات نہ کہتے تھے، اللہ کی عبادت میں مجاہدہ کرتے تھے، اہلِ دنیا کے منہ پر کبھی ان کی تعریف نہ کرتے تھے۔ مسائلِ دینیہ میں خاموشی اور سکون کے ساتھ غور کرتے۔ عظیم عالم ہونے کے باوجود سادگی پسند اور منکسر المزاج تھے، سوال کا جواب دیتے وقت کتاب و سنت کو سامنے رکھتے، اس میں جواب نہ ملتا تو قیاس کرتے۔ کسی کا ذکر کرتے وقت اس کی بھلائیوں پر نظر رکھتے، اگر کسی کو کچھ دیتے اور وہ ممنون ہوتا تو ان کو افسوس ہوتا اور کہتے کہ شکر کا مستحق تو صرف اللہ ہے۔"[1]

ایک صاحب کا اور بیان ہے کہ امام صاحب ایک روز بازار میں جا رہے تھے، ایک شخص آپ کو دیکھ کر چھپ گیا، آپ نے اس کو بلا کر چھپنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا کہ میں آپ کا دس ہزار درہم کا مقروض ہوں، کافی عرصہ ہو گیا لیکن ادا نہیں کر سکا، آپ سے شرم آتی ہے اس لیے چھپ گیا۔ اس کی گفتگو کا آپ کے دل پر بہت اثر ہوا اور فرمایا کہ میں خدا کو گواہ کر کے تمھارا قرض معاف کرتا ہوں۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ امام صاحب کہیں جا رہے تھے، راستے میں کیچڑ تھی، آپ کے پیر کی ٹھوکر سے کیچڑ سامنے کے مکان کی دیوار پر

---

[1] بحوالہ سیرۃ النعمان ۔ ج ۱ ۔ ص۸

پڑ گئی۔ آپ پریشان ہو گئے کہ اسے کیسے صاف کریں، اس لیے کہ اگر صاف کرتے ہیں تو دیوار کی مٹی بھی جھڑے گی اور اگر اسی طرح چھوڑ دیں تو دیوار خراب رہے گی۔ آپ اسی پریشانی میں مبتلا تھے کہ مالک مکان آ گیا، وہ یہودی تھا اور اتفاق سے آپ کا مقروض تھا سمجھا کہ آپ قرض وصول کرنے آئے ہیں اس لیے دیکھتے ہی معذرت کرنے لگا۔ آپ نے کہا کہ اس وقت میں قرض کے سلسلے میں نہیں بلکہ تمھاری دیوار کی وجہ سے پریشان ہوں اگر کیچڑ صاف کرتا ہوں تو دیوار کی مٹی جھڑے گی اور میں گنہ گار ہوں گا، نہ صاف کروں تو دیوار خراب رہے گی۔ اس بات کا یہودی پر اتنا اثر ہوا کہ فوراً ہی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔[1]

امام صاحب کو پیشہ تجارت ورثے میں ملا تھا، کپڑوں کی تجارت بہت وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، مختلف شہروں میں ان کے نمائندے کپڑوں کے تھان فروخت کرنے کے لیے جاتے تھے، ایک مرتبہ جب امام صاحب نے تھان باہر بھیجے تو کہلایا کہ فلاں تھان میں عیب ہے اسے فروخت کرتے وقت خریدار کو اس عیب سے مطلع کر دیا جائے، اتفاق سے بیچنے والے کے ذہن سے یہ بات نکل گئی، اور عیب کے بارے میں خریدار کو نہ بتا سکا۔ جب امام صاحب کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا اور تمام تھانوں کی رقم جو تیس ہزار درہم ہوتی تھی صدقہ کر دیا۔ ان کے اخلاق اور حسنِ سلوک کے ذکر سے ان کے تمام تذکرے بھرے ہوئے ہیں اور لوگوں نے بے شمار واقعات بیان کیے ہیں جو ان کے

---

[1] بحوالہ تذکرۃ المحدثین (سعیدی) ص۵۵، ۵۶

کردار اور سیرت کی تابناکی کو نمایاں کرتے ہیں۔

عبادت و ریاضت ان کا محبوب مشغلہ تھا، بڑے ذوق و شوق اور خشوع و خضوع سے اس میں لگے رہتے تھے، اکثر رات بھر عبادت میں گزار دیتے، برسوں عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ نماز یا قرآن پڑھتے وقت رقت طاری ہوتی اور خشیتِ الٰہی سے دیر تک روتے رہتے۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا کہ کسی آیت کو پڑھ کر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی اور بار بار اسی آیت کو دُہراتے رہتے اور روتے رہتے۔ ایک بار فجر کی نماز میں شریکِ جماعت تھے، امام نے ولا تحسبن اللّٰہ غافلا عما یعمل الظالمون الآیۃ پڑھی۔ امام ابو حنیفہ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی اور ان کا بدن کانپنے لگا۔ اسی طرح سے ایک بار عشاء کی نماز میں امام نے اذا زلزلت الخ پڑھی، امام صاحب پر رقت طاری ہوگئی اور ساری رات اسی کیفیت میں مسجد میں رہے۔

ایک بار بازار جا رہے تھے راستے میں کسی لڑکے کے پانو پر پانو پڑ گیا۔ وہ چیخ پڑا، امام صاحب کو اس کی چیخ سُن کر غش آگیا، ہوش میں آئے تو لوگوں نے اتنی سی بات پر بے قرار ہو جانے کی وجہ پوچھی تو جواب دیا ممکن ہے اس کی آواز ہدایت غیبی ہو۔ ایک مرتبہ دکان پر گئے تو نوکر نے کپڑے نکال کر رکھے اور بولا خدا ہم کو جنت دے۔ یہ سُن کر امام صاحب زار و قطار رونے لگے اور چہرے پر رومال ڈال کر چلے گئے۔ دوسرے دن نوکر سے کہا کہ ہم اس قابل کہاں کہ جنت کی آرزو کریں، یہی بہت ہے کہ عذاب سے بچ جائیں۔

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن اگر نہ مجھ سے مواخذہ ہو نہ انعام ملے تو میں بالکل راضی ہوں[1]۔

دوسروں سے ہمدردی اور خدمت کا جذبہ اپنی دولت و ثروت کے باوجود ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ ایک بزرگ ابراہیم بن عتبہ کسی کے چار ہزار درہم کے مقروض تھے، شرمندگی کی وجہ سے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے کسی دوست نے قرض ادا کرنے کے لیے چندہ جمع کرنا چاہا، جب امام صاحب کو خبر ہوئی تو سارا قرض ادا کر دیا اور فرمایا اتنی سی رقم کے لیے لوگوں کو کیوں زحمت دیتے ہو۔

طبیعت میں تواضع اور مزاج میں بے حد نرمی تھی، نہ کسی سے انتقام لیا نہ کسی پر لعنت بھیجی، نہ بُرا بھلا کہا اور نہ ہی کسی سے فریب اور بد عہدی کی۔ لوگوں کی سخت کلامی اور بدگوئی کا جواب بھی نرمی اور حلم سے دیتے اور عفو و درگزر سے کام لیتے۔ ایک بار ایک شخص نے ان سے بدتہذیبی سے گفتگو کی، امام صاحب نرمی سے جواب دیتے رہے یہاں تک کہ اس نے امام صاحب کو زندیق کہا، امام صاحب نے جواب دیا خدا تمھاری مغفرت کرے، وہ جانتا ہے کہ میری نسبت تم نے جو لفظ کہا دُرست نہیں ہے۔ ایک مرتبہ مسجد میں درس دے رہے تھے ان کے ایک دشمن نے وہیں ان کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا، امام صاحب نے کوئی توجہ نہ کی اور اپنے شاگردوں کو بھی روک دیا۔ جب امام صاحب گھر واپس ہونے لگے تو وہ بھی ساتھ

---

[1] سیرۃ النعمان۔ ج ۱۔ ص ۸۲، ۸۳

چل دیا اور راستے بھر اسی طرح کہتا رہا، جب امام صاحب گھر کے قریب پہنچ گئے تو بولے بھئی میرا گھر آگیا ہے کچھ باقی رہ گیا ہو تو اٹھا نہ رکھو اس لیے کہ اب میں اندر جاتا ہوں اور پھر تم کو موقع نہ ملے گا۔

امام صاحب کے پڑوس میں ایک موچی رہتا تھا، دن بھر کی مزدوری کے بعد رات کو اپنے دوستوں کو جمع کر کے شراب وکباب میں مست رہتا اور گاتا بجاتا۔ اس ہنگامے سے امام صاحب کو تکلیف ہوتی مگر اخلاق کی وجہ سے کچھ نہ کہتے۔ ایک رات کوتوال نے اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ امام صاحب کو رات کو اس کی آواز سنائی نہ دی تو صبح کچھ لوگوں سے سبب پوچھا۔ جب انھیں اس کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو خود کوتوال کے پاس گئے اور اسے رہا کرا لائے[1]۔

امام صاحب کی ذہانت وطباعی کا ان کے ہم عصروں نے لوہا مانا ہے، اکثر بڑے اہم مسائل اپنی حاضر جوابی اور حاضر دماغی سے فوراً ہی حل کر دیا کرتے تھے۔ علامہ ذہبی نے بھی ان کو اذکیا بنی آدم میں شمار کیا ہے۔ ان کی اس خوبی کا ذکر تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے اور بہت سے واقعات مثال میں لکھے ہیں۔

امام صاحب نے اپنے استاد حماد کی زندگی میں ہی علم و فضل میں کمال حاصل کر لیا تھا، اُن کے انتقال کے بعد لوگوں

نے ان سے درخواست کی اس جگہ کو پُر کریں اور ان کے حلقۂ درس کو جاری رکھیں۔ امام صاحب نے لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر یہ ذمّے داری قبول کر لی، رفتہ رفتہ ان کے حلقے کی شہرت ہو گئی اور بے شمار لوگ ان کے درس میں شریک ہونے لگے۔

بنو امیہ کا دور امام صاحب کے لیے اچھا گزرا، لیکن عباسی دور میں سیاسی شورشیں اُبھرنے لگیں، امام صاحب کا نام بھی ان میں ملوث تھا۔ خلیفہ منصور کو شبہ تھا کہ امام صاحب اس کے مخالفین میں ہیں اس لیے وہ ان سے خوش اور مطمئن نہ تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ ان کو نقصان پہنچا سکے۔ اس نے ان کو قضا کا عہدہ پیش کیا۔ امام صاحب نے اس سے انکار کر دیا۔ منصور کو یہ بات پسند نہ آئی اور آپ کو قید کرا دیا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ قید کی حالت میں آپ کو کوڑے لگائے جاتے تھے جس سے آپ کا انتقال ہوا۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ قید کے زمانے میں بھی آپ کا سلسلۂ درس قائم تھا، اور منصور یہ سمجھتا تھا کہ ان کو اس طرح سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اس لیے ان کو زہر دلوا دیا۔ جب امام صاحب نے زہر کے اثر کو محسوس کیا تو سجدہ کیا اور اسی حالت میں ۱۵۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ انتقال کی خبر ملتے ہی بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔ نماز جنازہ میں پچاس ہزار کا مجمع تھا اور آنے والوں کا سلسلہ برابر جاری تھا، مورخین نے لکھا ہے کہ چھ بار نماز جنازہ ادا کی گئی۔ وصیت کے مطابق خیزران کے مقبرے میں آپ کو دفن کیا گیا، دفن کے بعد بھی لوگ کئی ہفتوں تک ان کے جنازے کی نماز پڑھتے رہے۔ ان کے انتقال کی جس کو خبر ملتی افسوس کرتا، روتا اور علم و فقہ کے

---

[1] سیرۃ النعمان۔ ج ۱ ص ۷۷ تا ۷۹

نور کے اُٹھ جانے پر آنسو بہاتا۔

عام طور سے امام ابو حنیفہ کی شہرت و عظمت ان کے فقہ کی وجہ سے ہے، لیکن ائمۂ حدیث نے ان کے علم حدیث کا بھی اعتراف کیا ہے اور ان کو اس فن کا بھی امام مانا ہے۔ اس لیے کہ مدون فقہ کے لیے عالم حدیث ہونا ضروری ہے، کیوں کہ مسائل کا استنباط قرآن و حدیث اور رجال کے مکمل علم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس زمانے حدیث کی درس و تدریس دو طرح سے ہوتی تھی، ایک تو وہ جس میں حدیث کی تلاش جستجو اور راویوں کی چھان بین ہوتی تھی، دوسرا طریقہ حدیث سے استنباط اور تحقیق مسائل کا تھا۔ پہلی قسم کے لوگوں کو محدثین اور اہل الروایہ کہا جاتا تھا۔ دوسرے طبقے کے لوگ اہل الرائے یا مجتہد کہلاتے تھے۔ چونکہ امام صاحب کا زیادہ تر کام دوسری نوعیت کا تھا اس لیے اسی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ فن حدیث میں امام ابو حنیفہ کا کبار مجتہدین میں ہونا اس سے ثابت ہے کہ ان کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے۔

علامہ ذہبی نے بھی امام صاحب کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے[1]

امام صاحب کے زمانے تک فن حدیث ایک مستقل فن کی صورت میں مرتب ہو گیا تھا، لیکن محدثین کا زیادہ زور روایت پر تھا، امام صاحب نے احادیث کی جانچ پڑتال کے لیے روایت کے ساتھ درایت کے اصولوں سے کام لیا، اگرچہ اس کا رواج صحابہ کے زمانے سے ہی

[1] بحوالہ سیرۃ النعمان۔ ج ۲ ص ۱۴۵، ۱۴۶

ہو گیا تھا مگر امام صاحب نے ان سے بہت وسیع پیمانے پر کام لیا۔ اس اصول کی بنیاد اس پر تھی کہ اگر کوئی واقعہ یا بات قرین عقل نہ ہو، حالات، زمانہ اور طبیعت انسانی کے خلاف ہو تو اس کی صحت مشتبہ ہو گی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اصول مرتب کیے اور اس فن کی ترویج کی۔ بہرحال امام صاحب جس طرح سے فقہ کے امام تھے اسی طرح سے ان کو حدیث کا بھی امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہ نے جہاں ایک طرف علم کلام کی بنیاد ڈالی اور فقہ کو مدون کیا وہیں انھوں نے کتاب الآثار مرتب کر کے حدیث کی بہت بڑی خدمت کی۔ اس کتاب میں انھوں نے احکام والی احادیث کو ابواب فقہیہ کے تحت جمع کیا۔ احادیث صحیحہ کی سب سے قدیم کتاب یہی سمجھی جاتی ہے۔ اس سے پہلے حدیث نبوی کے جو صحائف تھے وہ کسی فن کے حساب سے نہ تھے، بلکہ ان کے جامعین کو جب اور جہاں جو حدیث یاد آئی یا مل گئی لکھ دی۔ امام شعبی نے بھی تبویب کی کوشش کی تھی مگر اس کا سلسلہ چند ابواب سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ بہرحال امام ابو حنیفہ نے اس کام کو خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا اور بعد کے لوگوں کے لیے ایک نئی راہ ہموار کی[1]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مُوطا سے پہلے احادیث صحیحہ کی کوئی کتاب مدون نہیں کی گئی تھی، یہ بات درست نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ کی کتاب الآثار مُوطا امام مالک سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اور

[1] ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۵۸

امام ابو حنیفہؒ کی تصانیف سے امام مالک کے استفادے کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں صراحت کے ساتھ موجود ہے[1]۔ کتاب الآثار کی روایات مؤطا کی روایات سے صحت میں کسی طرح سے کم نہیں ہیں۔ اسنادِ روایات کے اعتبار سے اس کے درجے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسے چالیس ہزار احادیث کے مجموعے سے منتخب کیا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ کی احتیاط کا بڑے بڑے محدثین نے اعتراف کیا ہے، انھوں نے کوفہ، بصرہ اور حجاز کی درس گاہوں میں ایک مدت تک علمِ حدیث حاصل کیا تھا، کتاب الآثار میں امام صاحب نے صرف ان احادیث کو شامل کیا ہے جن سے مسائل فقہیہ کا استنباط ہوتا ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیان کی گئی روایات کسی ایک شہر یا علاقے تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، حجاز و عراق وغیرہ کے محدثین کی بیان کردہ روایات بھی شامل ہیں۔ مسائل کے سلسلے میں اس میں حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایات موجود ہیں۔ کتاب الآثار کو حنفیوں کی امہات الکتب میں شمار کیا جاتا ہے[2]۔

کتاب الآثار کے متعدد نسخے امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں کی روایت سے پھیل گئے، مثلاً امام زفر[3]، امام ابو یوسف[4]، امام محمد بن حسن شیبانی[5]، امام حسن بن زیاد[6] نے الگ الگ روایت کی اور ان سے ان کے شاگردوں نے۔ ان نسخوں کو بعض علما نے مسند کہا ہے، بعض نے سنن، لیکن اصل نام کتاب الآثار ہی ہے۔ مولانا عبد الرشید نعمانی نے اپنی کتاب ابن ماجہ اور علمِ حدیث میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۵۰ تا ۱۶۷ [2] ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۷۰

[3] اس نسخے کا ذکر حافظ امیر بن ماکولا متوفی ۴۷۵ھ نے الاکمال (باقی اگلے صفحہ پر) (بقایا صفحہ گذشتہ) میں کیا ہے۔ الاکمال کے قلمی نسخے کتب خانہ ریاست ٹونک اور کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں موجود ہیں۔

[4] اس نسخے کا ذکر حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المضیئہ میں کیا ہے۔ اس نسخے کو بڑی تلاش و محنت سے حاصل کر کے مولانا ابو الوفا قندھاری صدر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد نے ۱۳۵۵ھ میں مصر سے شائع کیا۔

[5] یہ نسخہ کتاب الآثار کے تمام نسخوں میں سب سے مقبول و مشہور ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ قاسم بن قطلوبغا نے اس کے رجال پر کتابیں لکھی ہیں۔ یہ نسخہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

[6] ان کے نسخے کا ذکر حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں کیا ہے۔ کتاب الآثار کے تمام نسخوں میں یہ نسخہ سب سے بڑا ہے۔ اس میں چار ہزار روایات بیان کی گئی ہیں۔ اس نسخے کی شہرت مسند ابی حنیفہ للحسن بن زیاد کے نام سے ہے۔ یہ نسخہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

امام مالکؒ

(ولادت ۹۵ھ - وفات ۱۷۹ھ)

امام مالک کا خاندان عرب میں جاہلیت اور اسلام دونوں میں ممتاز تھا، آبا و اجداد یمنی تھے مگر رسالت مآب کی دعوت اسلام قبول کرنے کے بعد مدینے میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کے دادا ابو عامر عہدِ نبوی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے امام مالک کبارِ تابعین میں سے ہیں اور صحاح ستہ میں ان سے روایتیں مروی ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ سے انھوں نے کسبِ فیض کیا تھا۔

امام مالک کا سلسلۂ نسب یوں بیان کیا گیا ہے۔ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمر بن حارث بن غیمان بن جثیل بن عمرو بن حارث ذی اصبح۔ یہ یمن کے آخری شاہی خاندان

حمیر کی شاخ سے تھے[1] امام مالک کی تاریخ ولادت کچھ کے نزدیک ۹۳ھ ہے اور کچھ کے نزدیک ۹۵ھ۔ ہوش و خرد کی منزل میں قدم رکھتے ہی ان کے کان علم سے آشنا ہونے لگے۔ خود ان کا گھرانا علم و فضل سے مالا مال تھا، گھر سے باہر شہر میں بڑے بڑے علما و محدثین موجود تھے جو علوم شریعت کے نمایندے اور قرآن و سنت کے پاسبان تھے۔ مدینے میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ کے فیض یافتگان موجود تھے۔ ان صحابہ کرام کے تلامذہ قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، سعید بن مسیب، عبداللہ بن دینار، مسلم بن شہاب زہری وغیرہ اسی شہر کے مشاہیر اور علم کے درخشاں ستارے تھے۔ یہیں سے فتاویٰ، احکام شرعیہ اور مسائل فقہیہ طے ہو کر لوگوں کے سامنے پہنچتے تھے۔

امام مالک نے اسی مدینے میں آنکھ کھولی، اس وقت یہاں کے علما کا فیض جاری تھا، انھوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور جلد ہی اس دور کے تمام علوم کو بدرجۂ کمال حاصل کر لیا۔ ان کے اساتذہ و شیوخ کی فہرست خاصی طویل ہے، ان میں حضرت نافع (حضرت عبداللہ بن عمر کے آزاد کردہ غلام) کا نام سرِ فہرست ہے۔ امام مالک نے ان سے پوری طرح استفادہ کیا، ان کا مشہور سلسلہ روایت مالک عن نافع عن ابن عمر کو شرفِ قبول حاصل ہے اور اسے

---

[1] کتاب الانساب سمعانی ص ۱۴۱

سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مدینے کے دوسرے شیوخ سے بھی انھوں نے کسبِ فیض کیا تھا، مدینے کے بزرگوں کے علاوہ شام، بصرہ، خراسان وغیرہ کے اساتذہ جو حج و زیارت کی غرض سے آیا کرتے تھے، ان سے بھی استفادہ کیا تھا۔

علم حدیث کے ساتھ ساتھ علم فقہ کی تعلیم بھی شیوخ سے حاصل کرتے تھے، اس سلسلے میں ابو عثمان ربیعہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اہم تابعین میں سے تھے اور حضرت انس نیز دوسرے صحابہ سے فیض اٹھایا تھا۔ ربیعہ اجتہاد و استنباط مسائل کے لیے مشہور تھے، ان کی نظر فقہی مباحث پر پوری طرح سے تھی، ان کا شمار ثقہ لوگوں میں ہوتا تھا، حدیث و فقہ دونوں میں ماہر تھے۔ امام مالک نے ان سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ امام مالک نے انھی اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیے جو واقعی علم و ارشاد کے اہل تھے، علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے ساتھ صائب رائے کے مالک بھی تھے۔

بعض کتابوں میں خود ان کا بیان ہے کہ مدینے میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا کرتے تو ان کی دعا کی برکت سے بارش ہوتی، لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا اس لیے کہ یہ لوگ زہد و تقویٰ میں تو بے مثال تھے، لیکن حدیث و روایت اور فتویٰ کا کام محض زہد و تقویٰ سے نہیں چل سکتا اس کے لیے علم و فہم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جس زہد کے ساتھ فہم و فراست اور دانائی نہ ہو وہ علم و فن کے لیے مفید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی دوسری روایات ایسی ملتی ہیں جن سے اس بات

کا پتا چلتا ہے کہ ایمان داری، سچّائی اور عبادت و ریاضت اپنی جگہ بے مثال چیزیں ہیں مگر جب تک عابد و زاہد میں علم و تفقہ نہ ہو وہ اچھا محدث، مفتی اور فقیہ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی بیان کی ہوئی حدیث کو حجت بنایا جا سکتا ہے۔ روایت حدیث میں ان کی احتیاط کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بعض بزرگ جو اُس وقت زندہ تھے لیکن بہت بوڑھے ہو چکے تھے مثلاً ان کے دادا مالک بن ابی عامر، سالم بن عبد اللہ، سلیمان بن یسار وغیرہ سے انھوں نے بلا واسطہ کوئی حدیث نقل نہیں کی ہے اور اس کا سبب خود یہ بیان کیا ہے کہ میرے زمانے میں مدینے میں بعض ایسے اہم بزرگ موجود تھے جن کی عمریں سو سال سے متجاوز تھیں مگر میں نے ان سے روایت نہیں کی اس لیے کہ عمر کے ساتھ ساتھ عقل و حفظ میں بھی ضعف آ جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امام مالک جس شیخ کی روایت لے لیتے تھے عام طور سے لوگ اسے صحیح تسلیم کر لیتے تھے۔

امام مالک کو اللہ تعالیٰ نے قوی حافظ بھی عطا کیا تھا، اکثر باتیں ایک بار سن کر ان کے حافظے میں محفوظ ہو جاتی تھیں، حافظے کے سلسلے میں ان کا یہ قصہ بہت مشہور ہے کہ ایک بار اپنے استاد ربیعہ کے ساتھ امام زہری کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ اس دن امام زہری نے اہلِ مجلس کو چالیس حدیثیں لکھائیں، دوسرے دن جب پھر مجلس میں گئے تو امام زہری نے کہا کہ کل میں نے جو حدیثیں لکھائی تھیں وہ لاؤ تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ اس سے کیا

فائدہ پہنچا۔ ربیعہ نے کہا کہ اس مجلس میں ایک شخص ایسا ہے جو کل کی تمام حدیثوں کو زبانی سنا سکتا ہے، امام زہری نے پوچھا وہ کون ہے، ربیعہ نے امام مالک کی طرف اشارہ کیا اور امام مالک نے وہ تمام احادیث سُنادیں۔ امام زہری کو بہت تعجب ہوا اور انہوں نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ کسی کو بھی یہ حدیثیں یاد نہ ہوں گی۔

امام مالک کا دورِ طالب علمی غربت و افلاس میں گزرا، اکثر فقر و فاقہ کی نوبت رہتی تھی۔ بعض اوقات اپنے مکان کی چھت کی کڑیاں فروخت کر کے گزر اوقات کا انتظام کرتے لیکن اس کے باوجود طلب علم میں کمی نہ کرتے۔ خود کہتے تھے کہ کوئی شخص علم میں اُس وقت تک کمال حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ مبتلائے فقر نہ ہوا ہو اور علم کو اس پر ترجیح نہ دی ہو۔

امام مالک کی لیاقت اور ان کے علم کی شہرت بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اپنے شیوخ کی موجودگی میں ہی ان کی اہمیت ہوگئی تھی لیکن جب ان کے استاد ربیعہ کی وفات ۱۳۶ھ میں ہوئی تو متفقہ طور پر ان کو حدیث و فقہ اور اجتہاد و رائے کا امام مان لیا گیا۔

فنِ حدیث میں امام مالک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے غلام نافعؒ کے خاص شاگرد تھے۔ نافع حضرت ابن عمرؓ کے بعد ان کی مجلس کے جانشین ہوئے اور ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔ امام مالک بارہ برس تک ان کے درس میں شریک ہوتے رہے۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے

کہ امام مالک کی مجلس درس کا آغاز ۱۱۷ھ میں ہوا تھا۔ کتابوں میں ان کی مجلس درس کا حال تفصیل سے لکھا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کی مجلس میں صاف ستھرے فرش اور قالین بچھے رہتے تھے، فرش پر ایک تنکا بھی نظر نہ آتا تھا۔ حدیث کے املا کے وقت امام صاحب وسط میں اونچی جگہ پر بیٹھتے تھے۔ درس کے وقت خوشبودار چیزیں سلگائی جاتی تھیں۔ حدیث بیان کرنے سے قبل امام صاحب غسل یا وضو کرتے، اچھا لباس پہنتے اور خوشبو وغیرہ لگا کر مجلس میں تشریف لاتے۔[1] مجلس کے تمام شرکا ادب کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھتے، مجلس پر سکوت طاری رہتا، ان کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ رہتی تھی جس میں طلبہ، سیاح، امرا، علما اور عام لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ حدیث کا املا مجلسِ درس یا مسجد نبوی کے علاوہ کسی دوسری جگہ پر ہرگز نہ کراتے تھے۔ خلیفہ مہدی اور ہارون دونوں نے اپنے پاس بلا کر املا کی خواہش کی لیکن آپ تیار نہ ہوئے۔ جلدی میں، مصروفیت میں یا راہ چلتے ہوئے حدیث بیان کرنے کو خلافِ ادب سمجھتے تھے، اس لیے کہ حدیث سننے اور سمجھنے کے لیے سکون و اطمینان ضروری ہے اور ایسے مواقع پر اس کا امکان نہیں ہوتا مجلس میں بآواز بلند بولنا بھی ادب و تہذیب کے خلاف تھا۔

صبح کی نماز کے بعد آپ مصلی پر طلوعِ آفتاب تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ اس کے بعد لوگ آنے لگتے، آپ ان

---

[1] بستان المحدثین ص۴۲،۴۳

کی طرف متوجہ ہوتے، مجلس کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ آپ کے قریب مستعد و ذہین طلبہ بیٹھیں، پھر مرتبے کے لحاظ سے لوگ بیٹھتے جاتے تھے، مجلس کی یہ ترتیب خود آپ کی قائم کی ہوئی تھی۔ املا بہت آہستہ آہستہ کراتے تاکہ لکھنے میں کسی سے غلطی نہ ہونے پائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ طلبہ کی تعداد بہت بڑھ جاتی تھی؛ اس وقت امام کے املا کو مستملی آگے تک پہنچاتے تھے (جس طرح سے مکبّر امام کی تکبیروں کو دوسروں تک پہنچاتا ہے)، درس کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا تھا کہ احادیث وغیرہ کو پہلے سے خود لکھ لیتے یا کسی ہونہار شاگرد یا کاتب کو لکھا دیتے۔ یہی اجزا مجلس میں پڑھے جاتے اور ان کے مطالب اور دوسرے مباحث کی تشریح کی جاتی تھی۔ عام طور سے امام صاحب اسی دوسرے طریقے کے پابند تھے اور اسی کو بہتر سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اگر صرف یادداشت سے زبانی بولنا ہو تو کبھی عجلت اور کبھی مجمع سے گھبرا کر بیان میں تسامح ہوسکتا ہے، لیکن اگر کوئی چیز لکھی ہوئی سامنے موجود ہو تو ترتیب بھی بہتر ہوگی اور بیان کرتے وقت ذہن بھی منتشر نہ ہوگا اور پورے سکون و اطمینان کے ساتھ ضروری مسائل پر بحث اور ان کی تشریح ہوسکے گی۔ اس کے علاوہ خود پڑھ کر اس کی تشریح و بیان میں یہ اندیشہ بھی رہتا تھا کہ طلبہ متن و شرح میں ممکن ہے کسی وقت تمیز و تفریق نہ کرسکیں اور دونوں چیزیں ایک ساتھ نقل کرلیں۔ امام صاحب چونکہ دوسرے سے پڑھواتے اور خود اس کی تشریح کرتے اس لیے

اصل اور اس کی شرح و اضافہ کے مل جانے کا اندیشہ نہ رہتا تھا۔

ان کی مجلسِ درس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی اور شام، عراق، ترکستان، مصر، ممالک ایشیا و افریقہ و اسپین سے، طالبانِ علم بڑی تعداد میں ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے مدینہ منورہ آتے تھے۔ ان کے شاگردوں اور ان لوگوں کی تعداد جنھوں نے ان سے روایت کیا ہے بے شمار ہے، اکثر وہ لوگ جن سے ابتدا میں خود امام صاحب نے فیض اٹھایا تھا آخر میں ان کے علم سے مستفید ہوئے۔ شاگردوں کی جتنی بڑی تعداد ہر طبقے اور مرتبے کے لوگوں کی (جن میں اُمرا، ائمہ صوفیا، فقہا، ادبا اور فلاسفہ وغیرہ بھی شامل ہیں) امام صاحب کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے محدث یا فقیہہ کو نہیں ہوئی۔ ان کے بہت سے شاگرد اونچے درجے کے محدث اور فقیہہ شمار ہوئے، صحاح ستہ کے مصنفین بھی صرف ایک واسطہ سے امام مالک کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہیں اور اس پر ان لوگوں کو فخر و ناز ہے۔[1]

امام مالک کی فقہ اور ان کے فتاویٰ کی بنیاد مدینے کی فقہ پر ہے، ان کے کمال اور فضل کا اعتراف نہ صرف مدینے کے تمام شیوخ کو تھا بلکہ دوسرے بلاد و امصار کے لوگ بھی معترف تھے۔ حج کے زمانے میں جب تمام دنیا سے لوگ سمٹ سمٹ کر حرم میں جمع ہوتے اس وقت حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہوتا کہ سوائے امام مالک

---

[1] حیاتِ مالک

اور ابن ابی ذئب کے کوئی اور فتویٰ نہ دے[1]۔ عام طور سے حکومت کی طرف سے جس کی تنظیم و تکریم ہوتی ہے وہ مختلف فیہ مسائل میں حکومت ہی کی منشا کا ساتھ دیتا ہے، لیکن امام صاحب کی جلالت شان یہ تھی کہ وہ حق کی طرفداری کرنے میں کسی قسم کی جانب داری یا رعایت سے کام نہ لیتے، خواہ اس میں ان کو کتنی ہی دشواری یا مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ــــ ایک خصوصیت ان کی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جب تک کسی مسئلے کی جزئیات و فروعات پر ان کی پوری نظر نہیں ہوتی تھی اس پر کوئی فتویٰ نہ دیتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص کسی دور دراز علاقے سے ان کی مجلس میں حاضر ہوا اور کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب کے ذہن میں اس وقت وہ مسئلہ پوری طرح سے واضح نہ تھا اس لیے آپ نے فرمایا میں اسے اچھی طرح سے نہیں جانتا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ میں چھ ماہ کی راہ صرف اسی مسئلے کو معلوم کرنے کے لیے طے کر کے آیا ہوں، جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے میں انھیں کیا جواب دوں گا۔ آپ نے جواب دیا کہ کہہ دینا کہ مالک نے کہا ہے کہ میں جواب نہیں دے سکتا۔ امام صاحب کی یہ احتیاط دور والوں کے لیے زیادہ ہوتی تھی اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ مفتی کی رائے کسی مسئلے میں جو آج ہے کل وہ اپنے علم کی بنا پر بدل سکتی ہے، اس لیے اگر کسی کو آج ایک فتویٰ دیا اور کل رائے بدلی تو اسے کس طرح مطلع کیا جا سکے گا[2]۔

---

[1] ابن خلکان ج ۳ ص ۲ [2] تزئین الممالک ص ۱۴

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فتوے بہت کم دیتے تھے، جواب ہمیشہ سوچ سمجھ کر تلاش و جستجو کے بعد دیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ایک مسئلے کی چھان بین میں کھانا پینا اور نیند تک کو قربان کر دیتے تھے۔ لوگوں نے کہا بھی کہ حضرت آپ کی بات کو تو لوگ یوں بھی تسلیم کر لیتے ہیں، آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں۔ جواب دیا کہ اس حال میں تو مجھے اور بھی کاوش کرنی چاہیے تاکہ ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچے۔ اگر کبھی کسی مسئلے میں کوئی غلطی ہو جاتی اور اس کی اصلاح کی جاتی تو فوراً تسلیم کر لیتے۔ ان کے فتاویٰ کو ان کے شاگردوں نے جمع بھی کر دیا ہے، اس سلسلے میں پہلی کتاب اسد بن فرات قاضی افریقہ کی ہے جس کا نام اسدیہ ہے۔ دوسری کتاب جو بہت ضخیم ہے ابن قاسم (۱۹۱ھ) کی ہے جس کا نام المدونہ ہے، کی تدوین امام صاحب کے سامنے ہی شروع ہو گئی تھی، یہ کتاب مصر میں چھپ گئی ہے۔ تیسری ابن وہب مصری (۱۹۷ھ) کی کتاب المجالسات عن مالک ہے۔

امام صاحب کا محدثین میں بھی اونچا درجہ ہے اور ان کو ارباب رائے میں شمار کیا گیا ہے، بڑے بڑے محدثین ان کی روایت کی ہوئی حدیثوں کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں، عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے، روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث کا کوئی امانت دار نہیں۔ محدث ابن نہیک کا کہنا ہے کہ صحت حدیث پر میں مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ امام احمد بن حنبل سے کسی نے پوچھا کہ کوئی شخص کسی کی حدیث زبانی یاد کرنا چاہے تو

کس کی کرے جواب دیا کہ مالک بن انس کی۔ سفیان بن عینیہ اور سفیان ثوری بھی ان کے علم و فضل اور روایت حدیث کے قائل تھے۔ ابن معین کہا کرتے تھے کہ مالک خدا کی طرف سے خلق پر حجت ہیں، یہ بھی کہتے تھے کہ ان سے بڑھ کر کوئی قابل اعتماد نہیں۔ امام حدیث یحییٰ بن سعید قطان فرماتے تھے کہ مالک اس امت کے لیے رحمت ہیں۔ ابن ابی حازم سے پوچھا گیا خدائے کعبہ کی قسم مالک سے بڑا کوئی عالم تم نے دیکھا ہے، جواب دیا "خدایا نہیں"[۱]

امام مالک کا شمار عباد و زہاد میں تھا، درس و تدریس اور افتا سے جو وقت بچتا تلاوت کلام پاک اور عبادت الٰہی میں صرف کرتے۔ ان کی بہن سے کسی نے ان کی گھریلو زندگی اور کاموں کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ "المصحف والتلادة"۔ اس کے علاوہ ان کی صاجزادی اور بھانجے کا بیان ہے کہ جمعہ کی شب اور مہینے کی پہلی تاریخ کو عبادت و ریاضت ان کا دستور تھا۔ رسول اللہ صلعم سے ان کو غیر معمولی محبت تھی۔ بڑے ادب و احترام سے ان کا نام لیتے، نام لیتے وقت چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا، مسجد نبوی میں شور و غل کو بہت برا اور گستاخی سمجھتے تھے کہ حضورؐ کی آرام گاہ ہے غسل یا وضو کیے بغیر حدیث نبوی بیان نہ کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں کبھی سواری پر نہ نکلتے تھے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ جو سرزمین قدوم نبوی سے مشرف ہوئی ہو میں

---

[۱] حیات امام مالک

اسے جانوروں کے کھروں سے روندوں[۱]۔ مدینہ منورہ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ سوائے سفر حج کے وہاں سے باہر نہ جاتے تھے۔ خلیفہ منصور اور خلیفہ مہدی نے متعدد بار ان کو بغداد میں رہنے پر آمادہ کیا۔ سفر خرچ بھیجا مگر آپ راضی نہ ہوئے اور کہلا دیا کہ مالک سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا۔ اس محبت کی انتہا یہ ہے کہ جمہور اسلام کے خلاف مکہ معظمہ پر مدینہ منورہ کو فضیلت دیتے تھے۔[۲]

جود و سخا ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ مہمان نوازی میں بے مثل تھے، مہمان کے لیے میزبانی کے فرائض خود انجام دیتے، کھانا خود لاتے اور وضو کے لیے پانی پیش کرتے۔ صبر و ضبط اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ موزہ پہن کر درس کے لیے بیٹھ گئے، موزے میں بچھو تھا اس نے سترہ بار ڈنک مارا چہرے کا رنگ ہر بار متغیر ہوتا تھا مگر آداب مجلس کے خیال سے درس کے اختتام تک اسی حال میں رہے اور درس ختم ہونے کے بعد ہی موزہ اُتارا۔[۳]

امام مالک اپنی خودداری اور حق گوئی میں بھی بے باک تھے، ان کا خیال تھا کہ منصور کی بیعت خلافت جبری ہے اور جو کام جبراً کرایا جائے شرع میں اس کا اعتبار نہیں، حدیث میں ہے کہ اگر کسی سے جبراً طلاق دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔ جعفر جب مدینے

---

[۱] بستان المحدثین ص
[۲] تذکرۃ المحدثین بحوالہ اعلام علماء الاعلام
[۳] بستان المحدثین

کا والی بن کر آیا تو اس نے امام صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ آیندہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں اس سے لوگوں کو منصور کی جبری بیعت کے خلاف سند ملے گی لیکن امام صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور برابر جبر کو غیر شرعی بات ہونے کا فتویٰ دیتے رہے۔ جعفر نے غصے میں ان کو کوڑے لگوائے، جسم لہولہان ہوگیا، ایسی حالت میں جعفر کے حکم سے اونٹ پر بٹھا کر تشہیر و تذلیل کی غرض سے شہر میں گھمایا گیا، لیکن اس حال میں بھی ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی۔ اور برابر اپنی رائے کا اعلان کرتے رہے۔ جب منصور کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو بہت نادم ہوا، امام صاحب کو معذرت کا خط لکھا اور جعفر کو فوراً معزول کرکے تحقیر و تذلیل کے ساتھ بغداد طلب کیا۔

خلیفہ مہدی اور ہارون رشید نے بھی ان کی عزت و توقیر میں کمی نہ کی اور ان کے علمی مرتبے کو دوسروں پر ترجیح دیتے رہے۔ ایک بار مہدی نے اپنے بیٹوں موسیٰ اور ہارون کو حکم دیا کہ امام صاحب سے مؤطا سنیں، انھوں نے امام صاحب کو بلا بھیجا۔ امام صاحب نے کہلایا کہ علم بیش قیمت شئے ہے، شایقین خود اس کے پاس آتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں شہزادے خود آئے اور دستورِ مجلس کے مطابق خود مؤطا پڑھ کر امام صاحب کو سنائی۔ ہارون رشید امین اور مامون کو لے کر ان کی مجلس درس میں حاضر ہوا اور سماعت کی۔ امام صاحب نے علم کے وقار کو ہمیشہ بلند رکھا، امرا و خلفاء کے دربار میں جا کر درس نہ دیتے اور جب وہ لوگ ان کی مجلس میں آتے تو ان کے ساتھ اسی طرح پیش آتے جس طرح دوسرے طالبانِ علم کے ساتھ۔

آخر عمر میں کمزوری و ناتوانی بڑھ گئی تھی، لیکن اس حالت میں جب تک ممکن ہوا درس و تدریس کا کام جاری رکھا۔ آخر میں حالت زیادہ بگڑ گئی اور مرض شدید ہوگیا، لوگوں کو اندازہ ہوگیا کہ وقت آخر ہے، لوگ آخری دیدار کے لیے آنے لگے۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ بے شمار لوگ جنازے میں شریک تھے۔ جنۃ البقیع میں دفن ہوئے۔[1]

امام مالک نے متعدد کتابیں خود تصنیف کی ہیں یا ان کے شاگردوں نے ان کی مجلس درس میں سُن کر مرتب کیں اور ان سے منسوب ہیں:

۱۔ **مؤطا**: کتاب الآثار کے بعد یہ حدیث کا دوسرا مجموعہ ہے جو امتِ مسلمہ کے پاس موجود ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر آیندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

۲۔ **المدوّنہ**: یہ امام مالک کے فقہی ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے شاگرد ابن قاسم (۱۹۱ھ) نے ان کی زندگی ہی میں مرتب کر دیا تھا۔ بعض لوگ اسے امام صاحب کی تصنیف بھی کہتے ہیں۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، مصر سے چھپ گئی ہے۔

۳۔ **رسالہ مالک الی الرشید**: یہ خلیفہ ہارون الرشید کے نام امام صاحب کا ایک طویل خط ہے جس میں امام صاحب نے خلیفہ کو دینی و دنیاوی و اخلاقی نصیحتیں کی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس میں بیان کی گئی احادیث کو

---

[1] تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۳۵

بہت معتبر تسلیم نہیں کیا ہے۔ یہ رسالہ بھی چھپ گیا ہے۔

۴۔ کتاب الماثور عن مالک فی احکام القرآن: اس میں امام مالک سے آیات احکام کی تفسیریں روایت کی گئی ہیں۔ ان کو علوم قرآنی کے مشہور عالم ابو محمد قلی اندلسی (م ۴۳۷ھ) نے مرتب کیا ہے۔

۵۔ کتاب المناسک: یہ ایک بڑی تصنیف تھی جس میں حج کے احکام و مسائل کا بیان تھا۔

۶۔ کتاب المجالسات عن مالک: امام صاحب کے شاگرد ابن وہب نے امام صاحب کی مجلسوں میں بیان کیے گئے حدیث و آثار و اخلاق سے متعلق فوائد کو اس کتاب میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

چند رسالوں اور ایک تفسیر قرآن کی نسبت بھی ان کی طرف کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ متفرق مسائل میں ان کے فتاویٰ وغیرہ بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

امام مالک کی تصانیف میں سب سے اہم ان کی مؤطا ہے جو اہلِ مدینہ کے فتاویٰ اور روایات کا بہترین انتخاب ہے۔ مدینہ علوم اسلامیہ و حدیث نبوی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ امام مالک یہیں پیدا ہوئے پلے بڑھے اور یہیں کے علوم سے پوری طرح فیضیاب ہوئے۔ مؤطا میں انھوں نے اہلِ مدینہ ہی کی روایت کو بیان کیا ہے اور چونکہ انھوں نے روایات کی صحت کا پورا التزام رکھا ہے اس لیے یہ مجموعہ بغیر کسی رد و قدح کے صحیح تسلیم

کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

"پھر امام مالک نے مؤطا تصنیف کی اور حدیث اہلِ حجاز میں سے قوی روایت کو تلاش کرکے اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور تابعین و علماء مابعد کے فتاویٰ کو بھی درج کیا۔"[1]

امام مالک نے رواۃ کے بارے میں غیر معمولی تحقیق سے کام لیا اور جو شخص روایت حدیث میں ان کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا اس کی روایت کو نہ لیتے تھے۔ وہ صحیح روایات کے علاوہ کوئی دوسری چیز روایت نہ کرتے تھے اور نہ ہی کسی غیر ثقہ آدمی سے حدیث نقل کراتے تھے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے:

"بلاشبہ مؤطا کی دلوں میں جو وقعت اور قلوب میں جو ہیبت ہے اس کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔"[2]

امام صاحب نے جب مؤطا کی تالیف شروع کی اور دوسرے علماء کو اس کا علم ہوا تو وہ بھی اپنی اپنی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے لگے۔ لوگوں نے اس کا ذکر امام صاحب سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ "صرف حسن نیت کو بقا ہے۔" امام صاحب کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور اس دور میں مؤطا امام مالک کے طرز پر اور اس کے مقابلے میں جتنی بھی مؤطائیں لکھی گئیں ان میں سے کسی کا بھی مرتبہ ان کی کتاب کو نہ پہنچ سکا۔ امام صاحب نے اسے مکمل

---

[1] بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث ص۱۷۷ [2] ایضاً ص۱۷۷

کر کے شیوخ حدیث کے سامنے پیش کیا اور سب نے ان کے اس کام کو سراہا، ایک شاعر نے مؤطا کی بہت تعریف کی ہے، جس کا مفہوم ہے:

"مؤطا امام مالک کو مضبوطی سے پکڑ لو، اگر یہ کھو گئی تو پھر حق کی کوئی جگہ نہ ہوگی اور مؤطا کے لیے ان دوسرے علوم کو چھوڑ دو جن کے تم متلاشی ہو، اس لیے کہ مؤطا آفتاب ہے اور دوسری کتابیں ستارہ۔" [1]

مؤطا کے معنی ہیں روندا ہوا، علماء نے اس کے مجازی معنی یہ بیان کیے ہیں کہ جس پر عام ائمہ اور علماء اور اکابر چلے ہوں اور جس کو ان سب کی رایوں نے روندا اور پامال کیا ہو یعنی سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو اور اس سے اتفاق کیا ہو، چونکہ امام صاحب نے اسے بہت سے شیوخ کے سامنے پیش کیا تھا اور انھوں نے اس کو پسند کیا تھا اور اس سے اتفاق کیا تھا اس لیے اس کا نام مؤطا پڑا۔ [2] سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مؤطا اس راستے کو کہتے ہیں جس پر لوگ بکثرت گزرے ہوں، سنت کے معنی بھی راستے کے ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر آنحضرتؐ گزرے۔ غرض مؤطا وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرتؐ کے بعد تمام صحابہ گزرے۔ غرض مؤطا

---

[1] بستان المحدثین صہ ۹ تذکرۃ المحدثین، ج ۱، صہ ۴۶

[2] مقدمہ مسوی صہ ۶

کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے کہ یہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہ کا عمل رہا ہے اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔" [1]

امام مالک نے ایک لاکھ حدیثیں روایت کی ہیں انھی میں سے دس ہزار احادیث کو شروع میں مؤطا میں داخل کر لیا تھا پھر ان کی تہذیب و تنقیح کرتے رہے آخر ان میں سے ۱۷۲۰ روایات باقی رہ گئیں۔ چونکہ درس کے وقت امام صاحب کے بہت سے شاگرد احادیث و مسائل کو لکھ لیا کرتے تھے اس لیے مؤطا کے متعدد نسخے تیار ہو گئے۔ ان نسخوں میں حدیثوں کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مؤطا تیس مختلف طریقوں سے مروی ہے ان میں سے کچھ کے نزدیک سولہ اور کچھ کے نزدیک گیارہ معتبر ہیں۔ لیکن عام طور سے چار نسخوں کی صحت پر تمام علماء متفق ہیں، جن میں پہلا نسخہ یحییٰ بن یحییٰ اللیثی کا دوسرا ابن بکیر کا، تیسرا ابو مصعب کا اور چوتھا ابن وہب کا ہے لیکن ان چاروں میں یحییٰ اللیثی کی روایت والا نسخہ متداول اور مشہور ہے۔ عام طور سے یہی نسخہ لوگ پڑھتے ہیں۔

مؤطا سے قبل اور اس کے زمانے میں بھی بہت سی کتب احادیث مرتب کی گئیں لیکن کسی کو بھی شرفِ قبولیت اور صحت کا درجہ حاصل نہ ہو سکا، ان میں سے تقریباً سب ہی ضائع ہو گئیں۔ مؤطا امام مالک کی چند امتیازی خصوصیات یہ بیان کی جاتی ہیں:

---

[1] حیات مالک

۱- مُوطا سے پہلے جو کتبِ حدیث تیار ہوئیں ان کی بنیاد زیادہ تر صحابہ و تابعین کے آثار و فتاویٰ تھے، امام صاحب نے احادیث صحیحہ کو پہلی بنیاد اور آثارِ صحابہ و فتاویٰ کو دوسری بنیاد قرار دیا۔

۲- عام طور سے اس زمانے کی کتابوں میں صحت کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا تھا، لیکن امام صاحب نے اسی حدیث یا فتوے کو قبول کیا جس کی صحت پوری طرح ثابت تھی۔

۳- مُوطا کی تالیف مدینے میں ہوئی اور اس میں عام طور سے حجاز ہی کے محدثین و شیوخ کی روایتیں درج ہیں، اور علماء اس پر عام طور سے متفق ہیں کہ اہلِ حجاز کی حدیثیں اپنی صحت و سند کے لحاظ سے دوسری تمام جگہ کی حدیثوں پر فائق ہیں۔

۴- مُوطا کی تصنیف کے وقت بہت سے اہم تبع تابعین موجود تھے۔

۵- امام مالک کے نزدیک راوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس روایت کو بیان کرے اس کا حافظ بھی ہو۔

۶- رسول اللہ صلعم اور مولفین کے درمیان جتنے کم واسطے ہوں گے حدیث اتنی ہی معتبر و مستحکم ہوگی۔ مُوطا کی حدیثیں عام طور سے تین یا چار واسطوں سے بیان کی گئی ہیں۔

علمائے حدیث نے حدیث کی کتابوں کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے، مُوطا طبقہ اوّل میں شمار ہوتی ہے، یعنی اس کا درجہ بخاری و

مسلم کی صف میں ہے۔ امام صاحب کی زندگی ہی میں مُوطا کے نسخے بہت سے اسلامی ملکوں میں پھیل گئے تھے اور اسے ماخذ و منبع کے طور پر سمجھا جانے لگا تھا۔ کسی کتاب کے قبول عام کا ایک ثبوت یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی شرحیں لکھی جائیں، تعلیقات مرتب ہوں اور حواشی تیار کیے جائیں۔ علمائے حدیث کی ایک بڑی تعداد نے مُوطا کی طرف توجہ کی اور اس کی احادیث کی تخریج کی، مشکل اور نامانوس الفاظ کی تشریح کی، اس کی مشکلات کو حل کیا، اس کے مسائل کی توضیح کی، فقہی مباحث اور رجال پر کتابیں لکھیں، ان میں سے چند کے نام حسبِ ذیل ہیں:

۱- ابن حبیب مالکی (۲۳۹ھ)

۲- ابو عمر یوسف بن عبدالبر اندلسی (۴۶۳ھ) نے التقصی الحدیث المُوطا اور التمہید لمانی المُوطا من المعانی والاسانید کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔

۳- امام سیوطی (۹۱۱ھ) نے بھی کشف المغطا فی شرح المُوطا کے نام سے ایک کتاب لکھی پھر تنویر الحوالک کے نام سے اس کی تلخیص کی۔

۴- محمد بن عبدالباقی زرقانی مالکی (۱۰۱۴ھ) نے تین جلدوں میں مُوطا کی مفصل تشریح شرح زرقانی کے نام سے کی۔

ہندستان کے بعض علماء اور بزرگوں کو مُوطا سے بڑا شغف رہا ہے، خاص طور سے شاہ ولی اللہ (۱۱۷۶ھ) اور ان کے خاندان کے لوگ صحت احادیث کی وجہ سے اس کے بڑے قائل تھے۔ شاہ صاحب نے اس کی دو شرحیں المصفیٰ فارسی میں اور المسویٰ عربی میں لکھیں۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے بھی اوجز المسالک کے نام

سے اس کی مفصل شرح لکھی۔

کچھ لوگوں نے مؤطا کی تلخیص بھی کی ہے جن میں امام خطابی (۲۸۸ھ) سیوطی (۹۱۱ھ) ابن حزم ( ) ابوالولید سلیمان بن خلف باجی (۴۷۴ھ) اور ابن رشیق (۴۵۶ھ) وغیرہ مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ کتابیں لکھیں جن کی مجموعی تعداد ستر کے لگ بھگ ہے۔[1]

[1] آثر و معارف ص ۵۱،۵۰

امام شافعیؒ

ولادت ۱۵۰ھ۔ وفات ۲۰۴ھ

ان کا نام محمد بن ادریس اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ شافعی ان کے جد اعلا شافع کی طرف نسبت ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلعم سے ملتا ہے، ان کی پیدائش غزہ میں ۱۵۰ھ میں ہوئی[1] ان کا زمانہ علوم و فنون کے عروج کا زمانہ تھا، حدیث اور اس سے متعلقہ علوم کا ہر سمت چرچا تھا، فقہ نے باقاعدہ فن کی شکل اختیار کر لی تھی، امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ان کی دکھائی ہوئی روشنی میں برابر آگے بڑھ رہے تھے، امام مالک کا حلقۂ درس بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری تھا۔ امام شافعی نے اپنے دور کے بہت سے علماء سے کسب فیض کیا۔ اور پھر خود کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے اجتہادی نقطۂ نظر

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۳۳۱

کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ استخراج مسائل کے اصول وضوابط مقرر
کیے اور فقہ میں بہت نام پیدا کیا۔

امام شافعی کو ان کی والدہ بچپن ہی میں مکہ لے گئیں اور وہیں ان
کی پرورش ہوئی، ان کی ابتدائی زندگی تنگ دستی اور پریشانی میں
گزری۔ شروع میں تاریخ، ادب وشعر وغیرہ کی مروجہ تعلیم حاصل کی۔
پھر حدیث وفقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں
قرآن مجید اور مؤطا امام مالک حفظ کرلی۔ ابتدا میں اشعار عرب میں
خاصی دلچسپی لیتے تھے[1] پھر ان کو فقہ کا ذوق پیدا ہوا تو مسلم
بن خالد زنجی، جو اس وقت مکہ کے مفتی تھے، کی خدمت میں حاضر
ہوئے، ان سے استفادہ کے بعد مدینہ جاکر امام مالک کے
حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ جب انھوں نے امام مالک کے
سامنے مؤطا کی قرات زبانی کی تو امام مالک بہت خوش
اور متاثر ہوئے اور فرمایا تمھارے قلب میں ایک نور ہے، معاصی
سے اسے ضائع نہ کرنا، تم تقویٰ کو اپنا شعار بنانا۔ ایک زمانہ
آئے گا کہ خدا تمھیں عظمت دے گا۔

تھوڑے دن امام مالک سے استفادہ کرنے کے بعد مکہ معظمہ
واپس آگئے اور وہاں کے شیوخ سے کسب فیض کرتے رہے۔ امام
مالک کے علاوہ ان کے اساتذہ میں لوگوں نے سفیان بن عیینہ،
امام محمد، مسلم بن خالد، ابراہیم بن سعد، سعید بن سالم، عبدالوہاب ثقفی،

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۳۳۲

محمد بن علی، اسماعیل بن جعفر، محمد بن خالد اور عبدالعزیز ماجشون وغیرہ
کا ذکر کیا ہے۔

امام شافعی فکر معاش کے سلسلے میں پریشان رہتے تھے، کچھ
لوگوں کی سفارش پر انھیں نجران کا عامل بنادیا گیا، یمن کا والی بہت
ظالم تھا، امام شافعی اس کو ظلم وستم سے روکتے تھے اس لیے
وہ ان سے ناراض ہوگیا اور ان کی شکایت خلیفہ ہارون رشید
کو لکھ بھیجی کہ امام شافعی علوی سادات کے ساتھ ہیں اور اس
سے حکومت کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ ہارون رشید بہت ناراض ہوا
اور انھیں دارالخلافہ بھیجے جانے کا حکم دیا جس وقت امام شافعی
دربار میں پیش ہوئے، قاضی امام محمد وہاں موجود تھے، ان کی
سفارش پر امام شافعی کی رہائی ہوئی، یہ واقعہ ۱۸۴ھ کا ہے[1]

رہائی کے بعد امام شافعی امام محمد کے حلقۂ درس میں شامل
ہوگئے، یہیں سے ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، فقہی علوم کی
طرف ان کی توجہ بڑھی۔ امام محمد سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور
ان سے جو فیض ان کو پہنچا اسے اپنی زندگی کا سرمایہ قرار دیتے
تھے، اور کہا کرتے تھے کہ جو شخص فقہ میں نام کمانا چاہتا ہو وہ امام
ابوحنیفہ کے اصحاب سے استفادہ کرے کیونکہ اللہ تعالے نے استخراج
واستنباط مسائل کی راہیں ان لوگوں کے لیے کھول دی ہیں، قسم
کھاکر کہا کرتے تھے کہ اگر میں نے امام محمد کی کتابیں نہ پڑھی

[1] محدثین عظام، ص ۹۳

ہوتیں تو میں فقاہت کے اس درجے پر نہ ہوتا۔[1]

حدیث و فقہ دونوں میں امام صاحب کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے، ان میں سے کچھ تو ایسے ہوئے ہیں جو آگے چل کر بڑی حیثیت کے مالک ہوئے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: سلیمان بن داؤد، ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی، احمد بن حنبل، ربیع بن سلیمان، ابوالولید موسیٰ بن جارود، اسحاق بن راہویہ وغیرہ۔

امام شافعی بڑے خوش خلق اور فیاض تھے، دوسرے کے لیے اپنی ضرورت کو بھول جاتے تھے، طبیعت میں خودداری اور غیرت تھی، امرا اور اعیان حکومت سے کسی چیز کے طالب نہ ہوتے تھے، البتہ محبت و عقیدت سے دیے گئے ہدایا قبول کر لیتے تھے۔ لیکن فیاضیِ مزاج کی بنا پر ان کا ہاتھ اکثر خالی ہی رہتا تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید جب کبھی ان کو دربار میں بلاتا تو اشرفیوں کی تھیلیاں پیش کرتا، امام صاحب واپسی پر انھیں تقسیم کرتے ہوئے اس طرح گھر پہنچتے کہ ان کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہتا، لوگوں نے حلیۃ الاولیا کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب آپ مکہ معظمہ تشریف لائے تو آپ کے پاس دس ہزار درہم تھے۔ جب لوگوں کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو ملنے کے لیے بے شمار لوگ آنے لگے، جن میں بہت سے ضرورت مند بھی ہوتے تھے، انھوں نے وہ تمام درہم ان لوگوں میں تقسیم کر دیے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر

---

[1] تذکرۃ المحدثین سعیدی ص ۱۲۲

مجھ سے کوئی شخص کسی چیز کے متعلق سوال کرے اور میں نہ دوں تو مجھے بڑی شرم محسوس ہوتی ہے۔ ایک روز مسجد سے گھر واپس آ رہے تھے، راستے میں ایک غلام نے اپنے آقا کا سلام کہہ کر ایک تھیلی پیش کی، ذرا سی دیر بعد ایک اور شخص آیا اور کہا کہ میرے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے اور میرے پاس کچھ نہیں ہے، آپ نے وہی تھیلی اسے دے دی۔ اکثر کہا کرتے تھے کرم و سخاوت انسان کی دنیا اور آخرت دونوں جگہ پردہ پوشی کرتے ہیں۔[1]

اسی کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کے اعلا مقام پر تھے، تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ رات کے تین حصے کرتے تھے، پہلے حصے میں علمی کام یعنی لکھنے پڑھنے کا کام کرتے، دوسرے حصے میں عبادت الٰہی میں مصروف رہتے اور آخری حصے میں آرام فرماتے۔ خشیتِ الٰہی کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کسی کو یہ آیت تلاوت کرتے سُنا ھٰذا یوم لاینطقون الخ (یعنی وہ دن ہوگا جب نہ کوئی بول سکے گا اور نہ کوئی عذر پیش کر سکے گا) تو خوفِ خدا سے کانپ اُٹھے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے، جب ہوش آیا تو توبہ و استغفار میں لگ گئے اور رو رو کر اللہ سے اپنی مغفرت کی دعائیں مانگیں۔ ان کے شاگردوں اور ہمعصروں نے ان کے مناقب لکھے ہیں اور ان کی جلالت شان، تبحر علمی اور استنباط مسائل کی تعریف کی ہے۔ امام صاحب کے کچھ اقوال لوگوں نے لکھے ہیں جن سے ان کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔ کہا کرتے تھے علم کی طلب کرنا نفل نماز سے بہتر ہے۔ جو شخص اپنی انانیت

---

[1] تذکرۃ المحدثین سعیدی ص ۱۲۴

اور عزو جاہ کو باقی رکھتے ہوئے علم حاصل کرنا چاہے وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا، علم عجز و انکساری سے حاصل ہوتا ہے۔ علماء کے بارے میں فرماتے تھے:

"علماء کا فقر اختیاری اور جہال کا فقر اضطراری ہوتا ہے
علماء کے لیے سب سے بڑے عیب کی بات یہ ہے کہ وہ دنیا
کی طرف راغب ہوں اور آخرت کو بھول جائیں۔
تواضع بلند کرداری کی دلیل ہے اور تکبر بدخلقی کی۔"

یوں تو امام شافعی کی اہمیت ان کے فقہ کی وجہ سے ہے، لیکن فقہ کا دارو مدار حدیث پر ہی ہوتا ہے اور جتنے بھی فقہا ہوئے ہیں انھوں نے فقہ کی بنیاد احادیث ہی پر رکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس دور میں دین سے واقفیت کے لیے حدیث کا مکمل علم ضروری ہوتا تھا۔ اس لیے لوگ اس فن کو ضرور حاصل کرتے تھے۔ درس و تدریس خواہ کسی بھی فن کی ہو دلائل و براہین احادیث ہی سے تلاش کیے جاتے تھے۔ اسی لیے امام شافعی نے بھی ایک طرف تو علم حدیث حاصل کیا اور پھر اپنے درس کے سلسلے میں اسے استعمال کیا۔ بعد میں ان کے شاگردوں نے ان کی بیان کردہ روایات کو جمع کر دیا۔

امام صاحب کی تصانیف کی مجموعی تعداد سو سے اوپر بیان کی جاتی ہے جن میں الرسالہ، اختلاف الحدیث، کتاب السنن، بیان الفرض، احکام القرآن، جامع العلم، کتاب الام اور کتاب المبسوط وغیرہ شامل ہیں

کتاب الام اور کتاب المبسوط فن حدیث میں ہیں جن کو ان کے

شاگردوں نے جمع کیا۔ اس کے علاوہ ان کی روایات کا ایک مجموعہ مسند شافعی کے نام سے مشہور ہے، جس کے متعلق شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں:

"یہ اُن احادیث مرفوعہ کا مجموعہ ہے جن کو خود امام شافعی اپنے شاگردوں کے سامنے سند کے ساتھ بیان فرمایا کرتے تھے۔ ان حدیثوں میں سے جو حدیثیں ابو العباس محمد بن یعقوب الاصم نے ربیع بن سلیمان مرادی سے سن کر کتاب الام اور مبسوط کے ضمن میں جمع کر دی تھیں، ان کو ایک جگہ جمع کر کے مسند امام شافعی نام رکھ دیا۔ ربیع بن سلیمان نے جو امام شافعی کے بلا واسطہ شاگرد ہیں تمام حدیثوں کو امام شافعی سے سنا ہے ــــ بہرحال وہ مسند نہ مسانید ہی کی ترتیب پر ہے اور نہ ابواب کی بلکہ اس میں جو حدیث جہاں اور جیسے چاہا لکھ دیا۔ اسی وجہ سے اس مجموعے میں بہت تکرار ہے۔"[1]

امام شافعی نے باقاعدہ درس حدیث کی کوئی مجلس قائم نہیں کی، وہ امام اور مجتہد تھے، حدیث کے فن سے پوری طرح واقف تھے اور اصولی حیثیت سے اس پر گفتگو کرتے تھے، استخراج و استنباط مسائل کے لیے صحیح حدیث ہی کو دلیل سمجھتے تھے۔ اسی لیے

---

[1] بستان المحدثین ص۵۱

حدیث کی تاریخ میں ان کا نام بھی آتا ہے۔ امام شافعی ساری عمر مذہب اور علم کی خدمت میں لگے رہے، ان کے زمانے میں بہت سی ایسی احادیث مل گئی تھیں جن سے پہلے کے ائمہ فائدہ نہ اٹھا سکے تھے اور حدیث کی عدم موجودگی میں اپنے اجتہاد وقیاس سے فتوے دیے گئے تھے اور وہ ان روایات کے خلاف تھے امام صاحب نے ان کو قبول نہ کیا۔ امام صاحب نے بہت سی روایات کو جمع کیا۔ حدیثوں کی تنقید کی اور اصول حدیث مرتب کیے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ "میں حدیث کے بہت سے علوم سے ناواقف تھا مگر جب میں نے امام شافعی کی صحبت اختیار کی تو مجھے ان چیزوں کا پتا چلا۔ کوئی ایسا محدث نہیں ہے جس نے قلم دوات کو ہاتھ لگایا ہو مگر شافعی کا اس کی گردن پر احسان نہ ہو۔" [1]

ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح میں لکھا ہے کہ ان کے شاگرد مزنی مرض الموت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حال پوچھا تو فرمایا دنیا سے کوچ اور احباب سے جدائی کا وقت ہے، موت کا پیالہ پیش ہوا چاہتا ہے اور نتیجۂ اعمال نکلنے والا ہے۔ عنقریب اللہ کے دربار میں حاضری ہوگی۔ کون جانے میری روح جنت کی طرف روانہ ہوگی جس پر میں اس کو مبارکباد دوں یا نار کی طرف جس پر میں اس سے تعزیت کروں۔ پھر آپ پر گریہ

[1] ابن خلدون بحوالہ محدثین عظام صـ۹۹

طاری ہوگیا اور وجد کی حالت میں بار بار اس مفہوم کا شعر پڑھتے تھے:

"میرے گناہ بہت بڑے بڑے ہیں لیکن میں
تیری رحمت کی طرف نظر کرتا ہوں تو وہ میرے
گناہوں کی نسبت کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔" [1]

۵۴ سال کی عمر میں ۲۰۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ مصر میں آپ کا مزار ہے جو مرجع خلائق ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ

(ولادت سنہ ۱۶۴ھ ۔ وفات سنہ ۲۴۱ھ)

ان کی ولادت ۱۶۴ھ میں ہوئی، ان کا خاندانی سلسلہ بنو شیبان سے ملتا ہے جو قبیلہ عدنان کی ایک شاخ تھا، ان کا خاندان دینی اور دنیاوی دونوں میدانوں میں مشہور تھا۔ یہ بچپن ہی سے علم کے شوقین تھے، حافظہ بہت اچھا تھا، چھوٹی عمر میں ہی قرآن مجید حفظ کرلیا تھا اس کے بعد حدیث پڑھنا شروع کیا اور جلد ہی اس فن کی تکمیل کرلی۔ ان کی ابتدائی تعلیم بغداد میں ہوئی۔ اس کے بعد کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن اور شام وغیرہ گئے اور وہاں کے علماء سے کسب فیض کیا۔

ان کے اساتذہ میں حافظ ہشیم، سفیان بن عینیہ، سلیمان بن داؤد طیالسی، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن سعید وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ امام شافعی سے بھی تلمذ کیا تھا، ان سے انھوں نے فقہ اور حدیث کی تعلیم خاص طور سے حاصل کی تھی، جب امام شافعی بغداد سے مصر

چلے گئے تو امام احمد اپنی تنگ دستی کی وجہ سے ان کے پاس نہ جاسکے۔ ان کو امام شافعی سے بڑی محبت تھی اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اکثر ان کے ساتھ سفر کرتے اور ان سے حدیث و فقہ کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے۔ امام شافعی کو بھی ان سے بہت انس تھا، ان کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کے ساتھ ساتھ ان کی دیانت و ثقاہت کے بھی قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے روایت بھی کرتے تھے۔ اکثر جب فتویٰ دیتے تو امام احمد سے بھی اس مسئلے پر ان کی رائے معلوم کرتے، فرماتے تھے جب میں نے بغداد کو چھوڑا اس وقت وہاں علم و فضل اور ورع و تقویٰ میں کوئی شخص امام احمد سے بڑھ کر نہ تھا۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ انھوں نے ان سے بہتر آدمی نہیں دیکھا امام ابوثور ان کو سفیان ثوری سے بڑا عالم اور فقیہ کہتے تھے۔ محمد علی بن مدینی ان کو حجت تسلیم کرتے تھے اور ان کے فتویٰ کو قابل عمل مانتے تھے۔ ان کے تقویٰ اور دیانت کی تعریف کی گئی ہے اور جو شخص ان پر شبہ کرے اسے قابل مذمت سمجھا گیا ہے۔ سفیان بن وکیع کہتے تھے کہ امام احمد کی برائی کرنے والے کو فاسق و فاجر سمجھنا چاہیے[1]

امام احمد علم حدیث کے ماہر تھے، محدث کے لیے جن خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب ان میں موجود تھیں، قوت حافظہ غضب کی تھی۔ ان کے پاس بہت سی کتابیں تھیں جو ان کی زبانی

[1] تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۱۲۸، بحوالہ طبقات الشافعیہ وطبقات الفقہاء۔

یاد تھیں، حدیث کے ماہرین نے ان کو ثقہ لوگوں میں شمار کیا ہے۔
امام شافعی کہتے تھے کہ بغداد کی عجیب چیزوں میں ایک یہ نوجوان بھی تھا، کم سنی کی وجہ سے جس کے بال بھی سیاہ نہیں ہوئے تھے مگر جب وہ حدثنا کہتا تھا تو ہر طرف سے صدوق کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ حدیث کے بہت بڑے حافظ تھے، کھری کھوٹی روایتوں کو آسانی سے الگ الگ کر سکتے تھے، ان کے بزرگوں اور ہمعصروں کو ان پر پوری طرح اعتبار تھا اور ان کی بیان کی ہوئی روایات کو آسانی اور بغیر تکلف کے قبول کر لیتے تھے۔ امام احمد اپنے کو دنیا اور دُنیا کی الجھنوں سے الگ رکھتے تھے، نام و نمود کی بھی ان کو خواہش نہ تھی، ان کی علمی شہرت بہت تھوڑے عرصے میں اطراف عالم میں پھیل گئی، ہر وقت علم کے پیاسوں کی بھیڑ آپ کے یہاں جمع رہتی۔ آپ نے چالیس سال کی عمر میں درس و تدریس کا کام شروع کیا، درس کی مجلس میں لوگ بہت سکون و یکسوئی کے ساتھ شریک ہوتے۔ وقار و سنجیدگی اور ایک خاص قسم کا رُعب اس مجلس کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اس میں شریک ہونے والے لوگ بڑے غور و انہاک سے درس سنتے۔ اکثر اس مجلس کے شرکار کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔

نماز، روزے اور دوسرے مذہبی فرائض کے شروع ہی سے پابند تھے، عام طور سے اذان سے پہلے ہی نماز کے لیے

تیار ہو جاتے اور باجماعت نماز ادا کرتے، نوافل و تہجد کے بھی بچپن ہی سے پابند تھے۔ تلاوت اور دعا و استغفار بھی معمول میں شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول بھی کرتا تھا، اسی وجہ سے لوگ ان سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔ ضرورت مندوں اور غریبوں کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ امرا اور بادشاہوں کی بھیجی ہوئی چیزوں کو قبول نہ کرتے اور اگر کبھی لے لیتے تو غربا میں تقسیم کر دیتے۔ دنیا اور دنیا کے لوازمات سے ان کو ذرا بھی دل چسپی نہ تھی۔ اپنی مجلس میں اس قسم کے تذکروں کو پسند نہ کرتے تھے۔ خلفائے وقت نے دولت و ثروت سے ان کی جھولی بھرنی چاہی مگر انھوں نے اسے قبول نہ کیا۔ کہتے تھے دُنیا چند روزہ ہے، یہاں کے عیش و عشرت سے آخرت کی زندگی کیوں خراب کروں، جس دن ان کے پاس کچھ نہ ہوتا اس دن کو اپنے لیے مبارک اور آرام کا دن قرار دیتے تھے۔ رسول اللہ صلعم کی زندگی کی سچی پیروی آپ کا بنیادی اصول تھا۔ سنتِ رسول کی حمایت اور اُسے عام لوگوں تک پہنچانا آپ کا مقصد تھا۔ خود نہ کسی سنت کو چھوڑتے اور نہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے جو سنت سے بے رغبتی کریں۔

خلفاء و سلاطین سے دور دور رہتے تھے، ان کے پیش کیے ہوئے عہدوں کو قبول نہ کرتے تھے۔ امام شافعی نے ان کو یمن کا قاضی بننے کی ترغیب دی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں آپ کے پاس علم کی تلاش میں آیا ہوں، اگر آپ کے پاس علم کی دولت نہ ہوتی تو میں آپ سے تعلقات منقطع کر لیتا۔ کچھ لوگوں نے ان کو

مشورہ دیا کہ اُمراء و سلاطین سے قریب ہو کر ان کی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں آسانی ہوگی، انھوں نے جواب دیا کہ ان کی صحبت بہت خطرناک اور بڑا فتنہ ہے، جب ان سے دور رہ کر بچنا مشکل ہوتا ہے تو قریب رہ کر زیادہ خرابی کا ہی امکان ہے۔

خلیفہ متوکل آپ کا بہت قدردان تھا، اکثر خیریت معلوم کرنے کے لیے آدمی بھیجتا، امورِ سلطنت اور اہم مسائل میں ان کی رائے لیتا، عزت و تکریم کے ساتھ مال و دولت بھی پیش کرتا۔ لیکن یہ سب چیزیں ان کے لیے بوجھ ہوتی تھیں اور کبھی کبھی اس پر رویا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفہ متوکل کے اصرار سے مجبور ہو کر اس سے ملنے گئے، چند روز قیام رہا مگر شاہی کھانوں سے پرہیز کیا، صرف ستو کھاتے اور روزہ رکھتے۔ خلیفہ نے خلعت دی جب واپس ہونے لگے تو اُسے وہیں چھوڑ دیا اور فرمایا کہ اسے فروخت کر کے رقم کو ضرورت مندوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ اپنے عزیزوں اور ارادت مندوں کو بھی اُمراء اور رؤساء سے ملنے سے بچنے کی رائے دیتے تھے۔ ایک بار کئی روز کے فاقے کے بعد کسی شاگرد سے آٹا اُدھار لیا، جب روٹی پک کر آئی تو پوچھا اتنی جلدی کیسے تیار ہو گئی، جواب ملا کہ پڑوس میں چولھا جل رہا تھا جلدی کے خیال سے وہیں پکا لیا، آپ نے اس حال میں بھی اس روٹی کو کھانے سے انکار کر دیا کہ وہ پڑوسی اُمراء کے تحفے قبول کرتے تھے۔ ایک مرتبہ متوکل نے کچھ درہم بھیجے، اُن کو اس کی وجہ سے نیند نہ آئی، آخر گھر والوں کو بلا کر کہا کہ مجھے ان درہموں کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی ہے اس لیے انھیں غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

گھر والوں نے اُسی وقت تمام رقم تقسیم کر دی تو آپ سو سکے۔

انکسار اور تواضع ان کے مزاج کا خاصّہ تھا، غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے باوجود ہر ایک سے بڑی خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے ملتے، فخر و برتری کا اظہار کسی وقت نہ ہونے دیتے۔ اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے، یہاں تک کہ وضو کے لیے بھی خود ہی کنوئیں سے پانی نکالتے، بیماری کی حالت میں نوکر پنکھا جھلتا تو اُسے روک دیتے۔ ہر شخص کے ساتھ حُسنِ سلوک کرتے؛ اپنے ساتھ دوسروں کے سلوک کا بدلہ بھی چکانے کی کوشش کرتے، اگر کسی کی بات ناگوار ہوتی تو اُسے برداشت کرتے، طبیعت میں وقار و متانت تھی، اسی لیے بلاوجہ گھومنا پھرنا، بازاروں میں جانا اور غیر ضروری باتیں کرنا پسند نہ کرتے تھے، تفریحات سے بھی پرہیز کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے علم کی عظمت و شان میں کمی آتی ہے، علمی مجلسوں کے بعد تنہائی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کی آمدنی کا ذریعہ ایک خاندانی جائداد تھی جس سے چند درہم ماہوار کی آمدنی ہوتی تھی، اسی میں گزر بسر کرتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے، چونکہ یہ آمدنی کسی طرح بھی ضروری اخراجات کی کفیل نہ ہو سکتی تھی اس لیے گھر میں کئی کئی دن چولھا نہ جلتا اور فاقہ ہوتا مگر آپ مطمئن رہتے اور اپنی حالت کسی پر ظاہر نہ کرتے۔ لوگ تحفوں یا رقموں کی پیش کش کرتے تو شکریے کے ساتھ واپس کر دیتے۔ غذا بہت معمولی اور سادہ کھاتے، اکثر خشک روٹی کے ٹکڑے بھگو کر سرکے سے کھا لیتے۔

مامون کے دور میں معتزلہ کے مذہب کو کافی عروج حاصل ہوا، اس کی وجہ خلیفہ کی سرپرستی تھی۔ خاص طور سے خلق قرآن کے مسئلے نے بہت شدت اختیار کی، لوگوں سے زبردستی قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کرایا جاتا، جو لوگ ایسا نہ کرتے ان کو سخت سزائیں دی جاتیں۔ یہاں تک کہ ان کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا جاتا۔ بہت سے علماء نے خوف زدہ ہو کر اس کا اقرار کر لیا، جو نہ مانے ان کو سزائیں بھگتنی پڑیں۔ امام صاحب سے جب اس مسئلے میں سوال کیا گیا تو فرمایا قرآن خدا کا کلام ہے اور میں اسے مخلوق نہیں کہہ سکتا۔ ان کو قید کر کے مامون کے دربار کے لیے روانہ کیا گیا۔ ابھی یہ راستے ہی میں تھے کہ مامون کا انتقال ہو گیا۔ امام صاحب کو اسی طرح بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر بغداد واپس لایا گیا اور قید رکھا گیا، مامون نے مرتے وقت اپنے جانشین معتصم کو وصیت کی تھی کہ خلق قرآن کے عقیدے کا لوگوں سے اقرار ضرور کرایا جائے، معتصم نے اس وصیت کو مامون سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ پورا کیا۔ امام صاحب کو بھی معتصم کے سامنے پیش کیا گیا۔ لوگوں نے ان کو بہت سمجھایا کہ جب دوسرے بہت سے علماء نے اسے تسلیم کر لیا ہے تو آخر آپ اکیلے ہی اس سے کیوں انکار کرتے ہیں اور سزاؤں کی تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے رخصت وغیرہ کی احادیث پیش کر کے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے کسی بھی بات کو نہ مانا، کہتے رہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ نبوی سے اس کے اقرار کا ثبوت پیش کرو تو مان لوں گا ورنہ نہیں جب لوگ ان کو سزاؤں کی ہولناکی سے ڈراتے تو حدیث سناتے کہ "تم سے پہلے کے لوگوں کو آروں سے چیر دیا جاتا تھا مگر وہ اپنے دین سے منہ نہیں پھیرتے تھے۔"

خود معتصم نے بھی اس بات کی کوشش کی کہ امام صاحب اپنے خیالات میں نرمی پیدا کر لیں مگر وہ کسی طرح سے راضی نہ ہوئے اور اپنے موقف پر قائم رہے، آخر معتصم کے حکم سے ان کے کوڑے لگائے گئے، تکلیف سے غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی، جب ذرا ہوش آتا تو لوگ پھر ان کو خلیفہ کی بات ماننے پر آمادہ کرتے، مگر یہ اس حال میں بھی کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ اسی کوڑے لگنے کے بعد ان کی حالت بگڑ گئی تو خلیفہ نے گھبرا کر ان کو رہا کر دیا۔ معتصم پر ان کے پختہ عقیدے کا اثر ہوا اور اتنی سختی برتنے پر پشیمانی رہی۔ رہائی کے بعد اس نے ان کی دیکھ بھال اور علاج کے لیے معقول انتظام کیا اور صحت یاب ہونے پر خوشی کا اظہار کیا۔ امام صاحب اتنی تکلیفیں اٹھانے کے بعد خاصے کمزور ہو گئے تھے، بعض زخم ایسے تھے جن کی تکلیف ساری عمر آپ محسوس کرتے رہے،

امام صاحب کہتے تھے جس وقت مجھ کو کوڑے لگانے کے لیے لے جایا گیا ایک شخص نے پشت سے میرا دامن پکڑ کر کہا میں بدمعاش ترین انسان ابوالہیثم ڈاکو ہوں، چوری اور ڈاکوں کے جرم میں مجھے ہزارہا کوڑے لگائے جا چکے ہیں مگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ تم کو خدا کی راہ میں سزا ملے گی اس لیے تم کو حق سے انحراف

کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ امام صاحب کو ابوالہیثم کی اس گفتگو نے بڑی ہمت دی اور وہ ہمیشہ اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہے۔

معتصم اور واثق کے بعد جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس نے کتاب و سنّت کے خلاف جو عقائد پھیل گئے تھے ان کو ختم کیا اور امام صاحب کی عزت و تکریم کی۔ اسی کے عہد میں معتزلہ کا زور کم ہوا اور ان کی قوت ٹوٹ گئی۔ امام صاحب چونکہ اپنے عقیدے پر پوری شدت سے جمے رہے اور جو حق سمجھتے تھے وہ کہتے رہے، اس لیے ان کی عزت، شہرت اور مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ امام صاحب کی ثابت قدمی اور قربانی نے اسلام کو بچایا۔

علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ:

"امام احمد کی ذاتِ گرامی صبر و ابتلا اور استقامت علی الحق کے لیے ضرب المثل ہے، تین جابر قاہر بادشاہوں کے ظلم و استبداد اور غیر معمولی مشکلات و شدائد کے باوجود ان کی استقامت و عزیمت میں فرق نہ آیا اور نہ وہ کتمانِ حق اور اخفائے علم کے مرتکب ہوئے اور نہ رخصتوں اور تقیہ کا سہارا لیا بلکہ ہر حال میں انھوں نے اپنے کو سنتِ نبوی اور آثارِ صحابہ سے وابستہ رکھا اور ان کی اشاعت و بدعات کا استیصال کرتے رہے۔ یہ وہ مخصوص فضل و کمال ہے جس میں امام صاحب کا

کوئی معاصر صاحبِ علم ان کا شریک نہیں"۔ [1]

علی بن مدینی کہتے ہیں:

"اللہ تعالےٰ نے یوم ردہ میں حضرت ابوبکر کے ذریعے سے اسلام کی مدد کی اور فتنۂ خلق قرآن میں امام احمد کے ذریعے اسلام کو بچایا"۔ [2]

۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ میں ۷۷ سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا۔ انتقال کی خبر سے ہر طرف غم کی لہر پھیل گئی۔ جنازے میں بے شمار لوگ شریک ہوئے، بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اتنی بڑی تعداد کسی اور کے جنازے میں دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی۔

امام احمد اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے مالک ہیں، یہ مسلمانوں کے چار بڑے فقہی مسلکوں میں سے ایک کے بانی ہیں۔ یہ دوسرے علماء و مجتہدین کی طرح سے عقلی توجیہات کے زیادہ قائل نہ تھے، ہر چیز کو قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھتے تھے اور جس کی مثال کلام اللہ اور حدیثِ نبوی میں نہ ملتی اسے تسلیم نہ کرتے تھے۔ غیر ضروری سوالات سے احتراز کرنے کو کہتے تھے۔ قرآن اور صفاتِ الٰہی کے بارے میں ان کی رائے مستحکم تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جس طرح سے اللہ قدیم ہے اسی طرح سے اس کی صفات بھی قدیم ہیں، چونکہ کلام اللہ کی صفت ہے اس لیے وہ بھی قدیم ہے۔ وہ کسی بھی مسلمان کو کافر نہیں سمجھتے تھے خواہ وہ احکامِ خداوندی کو پورا

---

[1] بحوالہ تذکرۃ المحدثین، ج ۱ ص ۱۵۱ ، [2] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲ ص ۱۸

کرے یا نہ کرے، البتہ اس کے گناہگار ہونے کے قائل تھے۔ چونکہ امام احمد احادیثِ نبویہ پر زیادہ اعتماد کرتے تھے اس لیے بعض پرانے علماء نے ان کو فقیہہ سے زیادہ محدث کا درجہ دیا ہے۔ مثلاً ابن جریر طبری، ابن عبدالبر، ابن قتیبہ وغیرہ نے ان کو اس زمرے میں شامل کیا ہے، مگر عام طور سے ان کا شمار نہ صرف فقہا بلکہ فقہائے اربعہ میں کیا جاتا ہے۔ جن مذاہب کی صحت مسلّم اور مشہور ہے وہ چار ہیں: ابوحنیفہ، شافعی، مالک اور حنبل کے مذاہب[1]۔

امام صاحب فقہی مسائل میں کتاب وسنّت کو پہلا درجہ دیتے تھے۔ کتاب وسنّت کے بعد صحابہ کے فتاویٰ ان کے نزدیک قابل اعتماد تھے۔ اگر متعدد صحابہ سے کسی مسئلے میں مختلف اقوال ملتے تو جو قول کتاب وسنّت سے قریب تر ہوتا اس کو مانتے تھے۔ اس سلسلے میں صحابہ کی فضیلت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ مثلاً خلفائے اربعہ کو تمام اصحابِ رسولؐ پر ترجیح دیتے تھے، ان میں بھی شیخین اور شیخین میں بھی حضرت ابوبکرؓ کا درجہ بلند سمجھتے تھے اور ان کے قول کو قابلِ عمل جانتے تھے۔ کبھی کبھی جب ایک معیار کے صحابہ کے اقوال میں اختلاف ہوتا تو اپنی رائے کے مقابلے میں ان سب کے اقوال پر عمل کو بہتر جانتے تھے، یہاں تک کہ کم درجے کی حدیث پر عمل کو بھی اپنی رائے پر ترجیح دیتے تھے۔ قیاس ان کے یہاں آخری منزل میں تھا، جب مسئلے کا حل مندرجہ بالا صورتوں میں نہ مل سکے

[1] کشف الظنون، ج۲، ص۲۰۲

تو پھر عقل کے استعمال کی اجازت تھی۔ تصنیفِ کتب کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔

امام احمد چونکہ سنتِ نبوی پر پوری طرح سے کاربند تھے اس لیے شروع ہی سے احادیث جمع کرنے کا شوق تھا۔ آپ پوری توجہ کے ساتھ حدیث کی تلاش وجستجو کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے جو حدیث کا مجموعہ "المسند" کے نام سے یادگار چھوڑا ہے اسے سولہ سال کی عمر ہی سے مرتب کرنا شروع کر دیا تھا۔ طلبِ حدیث کے لیے آپ علماء ومحدثین کی خدمت میں حاضر ہوتے ان سے حدیثیں سنتے اور جمع کرتے۔ ان کے صاحبزادے عبداللہ نے ایک بار ان سے پوچھا کہ آپ کتابوں کی ترتیب وتدوین سے روکتے ہیں اور خود 'مسند' مرتب کر رہے ہیں تو جواب دیا کہ اسے میں نے عوام کی رہنمائی کے لیے مرتب کیا ہے۔ جب انھیں سنّتِ نبوی میں کوئی اختلاف ہوگا تو اسے دیکھ لیں گے[1]۔ بہرحال اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ 'مسند' خود امام صاحب کی جمع کی ہوئی ہے۔ امام صاحب کے درس میں حدیث سننے والے بھی جمع رہتے تھے اور پوچھ پوچھ کر حدیثیں سنا کرتے تھے۔ امام صاحب اسی مسند سے ان لوگوں کو سناتے تھے۔ انتقال سے کچھ پہلے اپنی اولاد اور اپنے مخصوص شاگردوں کو جمع کرکے مسند کی روایات سنائیں، بعد میں آپ کے صاحبزادے عبداللہ کی روایت کے مطابق موجودہ مسند مرتب ہوئی۔ بعض لوگوں نے اس شبہ کا اظہار بھی کیا ہے

[1] ابن حنبل ص۱۵۹

کہ عبداللہ نے بہت سی ایسی روایات بھی اس میں شامل کر دی ہیں جو اصل مسند میں نہیں تھیں، یہ شبہ غالباً صرف اس وجہ سے ہوا کہ امام صاحب سے جو لوگ کسی حدیث کے متعلق سوال کرتے تھے۔ آپ صرف وہی حدیث سُنا دیتے، لیکن بعد میں جب آپ کی عمر زیادہ ہوگئی اور یہ خیال آنے لگا کہ کسی وقت بھی اجل کا فرشتہ آ سکتا ہے تو آپ نے تمام احادیث کو سنا دیا۔[1]

بہرحال یہ مسند امام عبداللہ نے مرتب کی ہے اور اس میں وہ تمام روایتیں شامل ہیں جو آپ نے اپنے والد سے سُنی تھیں۔ اس سے پہلے بھی حدیث کی ایسی کتابیں تیار کی گئی تھیں لیکن اس مسند کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مسند میں احادیث صحابہ کی ترتیب کے مطابق جمع کی گئی ہیں۔ ایک صحابی کی حدیثیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں اس میں بھی یہ خیال ہے کہ صحابیوں کی ترتیب اسلام میں سبقت کے لحاظ سے ہو۔ صحابہ کے بعد تابعین کی ترتیب میں بھی خیال رکھا ہے۔ چونکہ حدیث کی کتابیں مرتب کرنے کا یہ انداز پُرانا ہے اس لیے بعد کے محدثین کو اس کے مطالعے میں مشکل پیش آئی۔ بعض لوگوں نے اسے ابواب کے تحت بھی از سرِ نو مرتب کیا مگر عام طور سے یہ نسخے اب نہیں ملتے ہیں۔ مصر کے احمد عبدالرحمٰن نے الفتح الربانی کے نام سے اس کو ابواب پر مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں

---

[1] ابن حنبل صـ۱۶

مکررات کو حذف کر دیا ہے۔[1] امام صاحب نے اپنی مسند میں صرف ثقہ راویوں ہی کی روایات کو شامل کیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ کسی روایت کو ثقہ سمجھ کر لکھ لیتے اور بعد میں معلوم ہوتا کہ وہ دُرست نہیں ہے تو اسے نکال دیتے۔ امام صاحب نے بعض ضعیف حدیثیں بھی شامل کی ہیں مگر اس کی وجہ خود انھوں نے یہ بیان کی ہے:

> "میں حدیث کی مخالفت نہیں کرتا خواہ وہ
> ضعیف ہی ہو، لیکن ایسا اُس وقت ہوتا ہے
> جب کہ اُس بارے میں کوئی حدیث صحیح
> نہ ملتی ہو۔"[2]

امام صاحب نے اس مسند کو تقریباً ساڑھے سات لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آخر عمر تک کاٹ چھانٹ کا سلسلہ جاری رہا۔ علماء نے مسند احمد کو حدیث کے اہم مجموعوں میں شمار کیا ہے، بعض نے اسے سنن ابی داؤد و جامع ترمذی کے ہم پلہ قرار دیا ہے اور بعض نے قدرے کم۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ مسند قابلِ اعتماد احادیث کا مجموعہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی شرحیں لکھیں اور اختصار بھی کیے۔ ان میں ابوالحسن بن عبدالہادی سندی ۱۱۳۸ھ کی شرح مسند خاصی اہم ہے۔ الدرالمنتقد مسند

---

[1] تذکرۃ المحدثین، ج ۱ صـ۱۷۶

[2] احمد بن حنبل، صـ۱۱۴

کا اختصار ہے جسے سراج الدین عمر اور زین الدین عمر نے مرتب کیا ہے۔ عقود الزبرجد علامہ سیوطی نے حروف معجم پر تیار کیا۔ غرائب المسند ابو عمر محمد بن عبد الواحد کی تالیف ہے۔ ابوالحسن علی بن ابوبکر ہیثمی نے اس کو چھ جلدوں میں ابواب پر مرتب کیا۔ اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے لوگوں نے شرحیں لکھی ہیں، اس کے رجال کی فہرست تیار کی ہے اور اس سے متعلق کتابیں لکھی ہیں۔

امام بخاریؒ

(ولادت ۱۹۴ھ ۔ وفات ۲۵۶ھ)

ان کا نام محمد اور کنیت ابو عبد اللہ ہے، ان کی ولادت بخارا میں شوال ۱۹۴ھ میں ہوئی۔ امام صاحب کے دادا مغیرہ اس خاندان کے پہلے فرد تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا، مغیرہ کے والد بروزبہ مجوسی تھے۔ پرانے زمانے کا دستور تھا کہ جس شخص کے ہاتھ پر مسلمان ہوتے اسی کی نسبت سے مشہور ہوتے، امام صاحب کے دادا بخارا کے امیر یمان جعفی کے ہاتھوں مسلمان ہوئے تھے اسی لیے جعفی مشہور ہوئے اور اسی وجہ سے امام صاحب کو بھی بعض لوگ جعفی کہتے ہیں۔ امام صاحب کے والد کا نام اسماعیل اور کنیت ابوالحسن تھی۔ ان کا شمار بخارا کے مشہور اہل علم میں ہوتا تھا، علمار نے ان کا شمار معتبر محدثین میں کیا ہے۔ امام صاحب کی پیدائش کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ امام صاحب کی والدہ ان کو اور ان

کے بڑے بھائی احمد کو بخارا سے مکہ معظمہ لے آئیں تاکہ تعلیم و تربیت بہتر طریقے پر کر سکیں۔

امام صاحب بچپن ہی سے اچھے ذہن اور عمدہ حافظے کے مالک تھے۔ ابتدا میں انھوں نے فقہ کی جانب توجہ رکھی اور اس سے فراغت کے بعد علم حدیث کی طرف توجہ کی، اس وقت تک منتشر احادیث کو مسانید میں جمع کیا جا چکا تھا اور علماء انھی کو سامنے رکھ کر درس و تدریس کا کام کرتے تھے۔ امام صاحب کے اساتذہ کے سلسلے میں تفصیل تو نہیں معلوم ہو سکی لیکن جن لوگوں کا پتا چلتا ہے اس فہرست میں سب سے زیادہ اہمیت اسحاق بن راہویہ اور علی بن المدینی کو حاصل ہے ان دونوں نے امام صاحب کے ذہن پر کافی اثر چھوڑا، جن دوسرے اساتذہ کے ناموں کا پتا چلتا ہے ان میں ابو عاصم، محمد بن عبد اللہ، قتیبہ بن سعید احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین وغیرہ شامل ہیں۔

امام بخاری نے چھوٹی عمر ہی سے احادیث کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز اپنے استاد اسحاق بن راہویہ کے درس میں حاضر تھے کہ وہاں حدیث کی جمع و تدوین کا ذکر نکل آیا، استاد نے تمام شاگردوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ کاش کوئی ایسی کتاب جمع ہو جاتی جو رسول اللہ صلعم کی مستند اور صحیح احادیث پر مشتمل ہوتی۔ اگر یہ تخاطب عام تھا لیکن امام صاحب کے دل پر نقش ہو گیا اور اسی وقت سے کوشش میں مصروف ہو گئے۔ امام صاحب بڑے ذہین تھے جو حدیث سنتے فوراً یاد ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابتدا میں

کتابت کے زیادہ قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لکھنے سے انسان کی یادداشت کی قابلیت کم ہو جاتی ہے اور اپنے آپ سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ لیکن پھر جب ان کو خود اپنی جامع کو مرتب کرنا ہوا تو یہ رائے بدلنی پڑی، علم تقویٰ اور پرہیزگاری میں بڑا اونچا مرتبہ رکھتے تھے[1]

امام صاحب جس مجلس درس میں شریک ہوتے اپنی ذہانت اور حدیثوں کی پرکھ سے اپنا وقار قائم کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہرت بہت جلد دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ ان کو بے شمار احادیث یاد تھیں۔ ان کی علمیت اور حافظے کے اس دور کے بڑے بڑے محدثین قائل تھے اور جب امام صاحب کسی بزرگ کے مجموعہ احادیث کی صحت کی تصدیق کر دیتے تو وہ اس کو بطور سند پیش کرتے تھے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد لوگ ان کے پاس حدیث سننے کے لیے آنے لگے۔ امام صاحب کی علمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک بار آپ بصرہ تشریف لے گئے تو وہاں کی جامع مسجد میں ایک بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں بہت سے بڑے بڑے علماء اور حفاظ حدیث شریک ہوئے۔ امام صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ حدیث سے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں، آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے علماء بصرہ آج میں تمھارے سامنے وہ حدیثیں پیش کروں گا جن کے راوی اسی شہر بصرہ کے رہنے والے ہیں مگر تم لوگ ان سے واقف نہیں ہو۔ اس

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۱۳۸

کے بعد آپ نے بہت سی حدیثیں لوگوں کو سنائیں جن کے سب رواۃ بصرہ ہی کے رہنے والے تھے۔ لہ

ان کی غیر معمولی یادداشت کے سلسلے میں یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب آپ بغداد تشریف لے گئے تو وہاں کے محدثین نے آپ کا امتحان لینا چاہا۔ اس مقصد کے لیے ان لوگوں نے سو حدیثیں منتخب کیں اور ان کی اسناد و متون کو الٹ پلٹ کر مختلف لوگوں کے سپرد کیا کہ اسی طرح سے امام صاحب کے سامنے پیش کریں۔ ان لوگوں نے اسی طرح سے وہ حدیثیں امام صاحب کو سنائیں، بہت سے لوگ اس موقع پر جمع تھے۔ امام صاحب ہر حدیث کو سن کر فرماتے میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ جب اسی طرح سے تمام حدیثیں پیش ہو چکیں تو امام صاحب نے ان تمام احادیث کو صحیح متون و اسناد کے ساتھ لوگوں کو سنا دیا۔ یہ ذہانت و قوت حافظہ کا اتنا بڑا کمال تھا کہ تمام لوگ دنگ رہ گئے اور آپ کے علم و فضل کے قائل ہو گئے۔

ان کی قوت حافظہ کے سلسلے میں تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بچپن میں اساتذہ کے درس حدیث میں شریک ہوتے، ان کے ساتھی حدیثیں لکھتے تھے اور یہ محض سن کر یاد کرتے۔ کچھ دن بعد ان کے ساتھیوں نے ان سے پوچھا کہ تم حدیثیں لکھتے نہیں ہو، ان کو کس طرح سے یاد رکھ سکو گے۔ امام صاحب

لہ تاریخ بغداد، ج ۲، ص ۱۵-۱۶

نے ان لوگوں سے کہا کہ تم لوگوں نے جو کچھ لکھا ہو مجھے دکھاؤ۔ جب ان لوگوں نے اپنی تحریریں دکھائیں تو امام صاحب نے ان کے علاوہ پندرہ ہزار حدیثیں ان لوگوں کو ایسی سنائیں جو ان لوگوں کی تحریر میں نہ لکھی تھیں۔ لہ

امام صاحب نے حدیثوں کو ان کے اصل راویوں سے سننے اور جمع کرنے کے لیے دور دراز کے سفر کیے۔ متعدد بار مصر، حجاز اور بصرہ گئے، ان جگہوں پر خاص مدت تک قیام کیا اور جن بزرگوں سے کسب فیض کر سکتے تھے پوری توجہ کے ساتھ کیا۔ اس زمانے میں نیشاپور علم حدیث کے اہم مراکز میں شمار ہوتا تھا، اس فن کے اہم لوگ یہاں درس و تدریس میں مصروف تھے۔ امام مسلم کے استاد امام محمد بن یحییٰ ذہلی جیسے مشہور محدث کے علم و فضل کا شہرہ تھا۔ امام بخاری نے بھی نیشاپور کا سفر کیا۔ جب آپ نیشاپور پہنچے تو آپ کا شاندار استقبال ہوا، لوگ شہر سے باہر نکل آئے اور انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ آپ کو ساتھ لے گئے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ایسا استقبال بڑے بڑے امراء و سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہو گا۔

امام صاحب نے یہاں کچھ دن قیام کیا اور حدیث کا درس دینے لگے۔ ان کی مجلس درس میں شہر اور قرب و جوار کے اہم علماء اور حدیث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات شریک ہوتے اور فیض اٹھاتے، امام ذہلی کے شاگرد خاص اور امام بخاری کے ہم عصر و ہم پلہ امام مسلم بھی ان کی مجلس میں بہت دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے۔ امام ذہلی نے اپنے تمام شاگردوں کو حکم دے رکھا تھا کہ امام بخاری کی مجلس میں

لہ تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۱۳۵

حاضر ہوا کریں، ایک روز وہ خود بھی ان کی مجلس میں تشریف لے گئے، چونکہ امام بخاری کی آمد اور ان کے حلقۂ درس کی وجہ سے دوسرے اساتذہ کے درس میں شرکاء کی تعداد گھٹ گئی تھی، اس لیے امام ذہلی کو یہ خیال ہوا کہ کہیں ان کی موجودگی میں ان کا کوئی شاگرد امام بخاری سے کوئی ایسا سوال نہ پوچھ لے جس کی وجہ سے مجھ میں اور امام بخاری میں اختلاف ہو جائے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مذاق اڑانے کا موقع ملے، اس لیے انھوں نے تاکید کی کہ کوئی اختلافی مسائل سے متعلق کوئی سوال وہاں نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود اس مجلس میں ایک شخص نے امام بخاری سے سوال کیا کہ الفاظ قرآن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، کیا وہ مخلوق ہیں۔ پہلے تو امام صاحب خاموش رہے لیکن جب اس شخص نے پھر اپنا سوال دہرایا تو امام صاحب نے جواب دیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے اور جو الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں وہ ہمارے افعال ہیں اور ہمارے افعال مخلوق ہیں۔

بہر حال یہ ایک طویل بحث ہو سکتی تھی لیکن امام صاحب نے اسے بہت ہی مختصر انداز میں ختم کر دیا۔ اس مجلس میں جو لوگ اس عقیدے کے قائل تھے کہ قرآن مخلوق ہے ان لوگوں نے بڑا ہنگامہ کیا اور مجبوراً صاحب خانہ نے ان لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ اس واقعے کے بعد امام صاحب کی ہر دلعزیزی میں قدرے کمی ہو گئی۔ خود امام ذہلی نے امام بخاری کے اس جواب کو پسند نہ کیا۔ جب اختلافات کی خلیج وسیع ہونے لگی تو امام بخاری نے نیشاپور سے رختِ سفر باندھا اور اپنے

وطن بخارا واپس روانہ ہوئے۔ جب بخارا والوں کو پتا چلا کہ امام صاحب واپس آ رہے ہیں تو ان لوگوں نے بے حد خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ شہر سے باہر ان کا شاندار استقبال ہوا، درہم و دینار ان پر سے نچھاور کیے گئے اور بڑی شان و شوکت اور تکریم و تعظیم کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے۔

وطن واپس آنے کے بعد کچھ دن سکون و اطمینان سے گزرے لیکن جلد ہی لوگوں نے والی بخارا کو ان کی طرف سے بدظن کر دیا اور اس نے ان کو بخارا سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ والی بخارا نے خواہش ظاہر کی کہ امام صاحب اس کے بچوں کو حدیث و تاریخ کی تعلیم گھر جا کر دیں لیکن امام صاحب نے اسے علم کی توہین قرار دے کر انکار کر دیا۔ اس پر والی بخارا نے کہا کہ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر لڑکے خود امام صاحب کے پاس آ جایا کریں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس وقت کوئی دوسرا طالب علم وہاں موجود نہ ہو۔ امام صاحب نے اس بات کو بھی قابل قبول نہ سمجھا۔ والی بخارا اسی وجہ سے آپ سے ناراض ہو گیا اور جلا وطنی کا حکم دیا۔ مجبوراً امام صاحب خرتنگ چلے گئے جہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ امام صاحب کو اپنی کس مپرسی کا شدت سے احساس تھا اور اکثر دعا کرتے تھے کہ اے اللہ زمین اپنی وسعت کے باوجود میرے لیے تنگ ہو گئی ہے اب مجھ کو اٹھا لے[1]

---

[1] تاریخ بغداد، ج ۲، ص ۳۴

آخر اُن کی دعا مقبول ہوئی اور ۲۵۶ھ میں باسٹھ سال کی
عمر میں عید الفطر کی رات کو انتقال کر گئے۔ عید کے دن بعد نماز
ظہر تدفین ہوئی[1]۔ ان کے انتقال کی خبر سے علماء و اعیانِ علم کی
مجلسوں میں غم و اندوہ کی لہر پھیل گئی۔

امام صاحب کے مزاج میں خودداری اور استغناء بدرجۂ اتم
موجود تھا، اس سلسلے میں ایک واقعہ اوپر گزر چکا ہے کہ انھوں
نے جلاوطنی کو پسند کیا لیکن یہ بات گوارا نہ کی کہ علم کو امراء و سلاطین
کے احکامات کا پابند کریں۔ ان کے حالاتِ زندگی سے اس بات کا
بھی پتا چلتا ہے کہ دنیادار علماء کی طرح سے انھوں نے اُمراء اور
بادشاہوں کی سرپرستی کو قبول نہ کیا، ان کی زندگی میں بڑی پریشانی
کے دور آئے مگر وہ ہمیشہ ثابت قدم رہے اور قناعت پسندی
وسادگی کے ساتھ زندگی گزار دی۔ امام صاحب اپنا روپیہ دوسروں
کو تجارت کے لیے دیتے تھے اور اسی کے نفع سے عام طور سے اپنی
زندگی کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ امام صاحب کو ان کی
زندگی ہی میں غیر معمولی شہرت و عزت حاصل ہوئی لیکن اس کے
باوجود ان کو اپنے علم پر کسی قسم کا فخر نہ تھا، اگر کسی مسئلے کا علم نہ
ہوتا تو بلاتکلف اپنی لاعلمی کو تسلیم کر لیتے اور پھر اُسے دوسروں
سے دریافت کرتے۔ ان کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا، دور دور
سے لوگ ان کے درس میں شرکت کے لیے آتے، درس کبھی مسجد میں

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۱۳۵

اور کبھی اپنے گھر پر دیتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں بہت سے مشہور
لوگوں کے ساتھ ساتھ امام مسلم، امام ترمذی اور امام نسائی جیسے
پائے کے محدثین بھی شامل تھے۔

امام صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا، ان کی کتابوں
کے جو نام ملتے ہیں ان میں سے کچھ کے نام درج ذیل ہیں:

الجامع الصحیح، الادب المفرد، رسالہ رفع الیدین، تاریخ کبیر، تاریخ
اوسط، تاریخ صغیر، الجامع الکبیر، کتاب الضعفاء، التفسیر الکبیر،
کتاب المبسوط، کتاب الاشربہ، قضایا الصحابہ، کتاب العلل، اسامی الصحابہ،
کتاب المناقب وغیرہ۔

ان تمام کتابوں میں سب سے اہم، مشہور اور زندہ جاوید تصنیف
الجامع الصحیح ہے، اس کتاب کا پورا نام "الجامع الصحیح المسند من حدیث
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے
اندازہ ہوتا ہے اس میں رسول اللہ صلعم کے اقوال و افعال و احوال
سند و متن کی صحت کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں۔ امام صاحب نے
اس جامع کو سولہ سال کی مدت میں مرتب کیا، یہ چھ لاکھ حدیثوں سے
منتخب ہے۔ اس میں امام صاحب نے انھیں احادیث کو لیا ہے
جن کی صحت ان کے مقرر کردہ اصولوں سے ثابت ہوتی تھی، ہر حدیث
کو شامل کرنے سے پہلے استخارہ کرتے، دو رکعت نماز پڑھتے اور جب
اس کی صحت پر قلب مطمئن ہو جاتا تو لکھ لیتے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ
آپ نے اسے بخارا میں لکھا، بعض کا خیال ہے کہ بصرہ میں اور بعض
کہتے ہیں کہ مکہ میں، غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس کی تالیف و

ترتیب میں خاصی مدت لگی اور امام صاحب نے اس زمانے میں مختلف جگہوں کے سفر کیے اور اسے ساتھ رکھا، اس لیے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا۔

اس کتاب کی وجہ تالیف کے سلسلے میں خود امام صاحب کی یہ روایت بہت مشہور ہے کہ ایک روز انھوں نے خواب دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور یہ پنکھا لیے ان کی مکھیاں جھل رہے ہیں۔ بیدار ہونے پر آپ نے لوگوں سے اس کی تعبیر دریافت کی تو لوگوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو جھوٹ منسوب ہے تم اسے رفع کرو گے۔ امام صاحب کے ذہن میں اپنے اُستاد اسحاق بن راہویہ کی خواہش کہ احادیثِ صحیحہ کا ایک مجموعہ مرتب ہو جائے پہلے سے موجود تھی، اس خواب نے اس عزم و ارادے کو مزید تقویت بخشی اور وہ اس کام میں لگ گئے۔

امام بخاری کے زمانے تک حدیث کے متعدد مجموعے مرتب ہو چکے تھے، جن بزرگوں نے اس سلسلے میں بڑی محنت و کاوش سے کام کیا تھا ان میں امام مالک، ابن جریج، امام اوزاعی، سفیان ثوری، نعیم بن حماد اور ابو سلمہ وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے جس قدر بھی سرمایۂ حدیث ممکن تھا بڑی تلاش و جستجو کے بعد مرتب کر دیا تھا۔ عام طور سے اُس وقت جو مجموعے ملتے تھے ان میں ہر قسم کی حدیثیں موجود تھیں، بہت سے لوگوں نے صحیح و غلط کی بھی زیادہ فکر نہ کی تھی، جب امام بخاری نے اس قسم کے تمام نسخوں پر نظر ڈالی تو ان کو اندازہ ہوا کہ اس سلسلے

میں باقاعدہ توجہ کی ضرورت ہے اور پھر اسی مقصد کے تحت انھوں نے اپنی جامع کو مرتب کرنا شروع کیا۔ چونکہ امام صاحب کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ حدیثیں جمع کر دی جائیں بلکہ وہ کھرے کھوٹے کو بھی الگ کرنا چاہتے تھے، علت و ضعف سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے، صحت کے ساتھ ساتھ نظم و ترتیب کی طرف بھی ان کی توجہ تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کا کام زیادہ مشکل تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس میں وقت بھی زیادہ لگا۔

امام صاحب نے اپنی صحیح میں نو ہزار بیاسی (۹۰۸۲) احادیث بیان کی ہیں جو چھ لاکھ (۶۰۰۰۰۰) حدیثوں سے منتخب کی گئی ہیں۔ اس میں ایک سو ساٹھ (۱۶۰) کتاب اور تین ہزار چار سو پچاس (۳۴۵۰) ابواب ہیں۔ اس میں بائیس (۲۲) ایسی احادیث ہیں جو محض تین واسطوں سے امام صاحب تک پہنچی ہیں[1]۔ ان پر امام بخاری کو فخر ہے۔ امام صاحب نے پہلے تو صرف احادیث کو جمع کیا۔ اس کے بعد ان کو تنقیدی نظر سے پرکھا، اصول و قواعد مرتب کیے، حدیث کے درجے مقرر کیے اور اس بات کی پوری کوشش کی کہ اس میں صرف صحیح اور انتہائی معتبر حدیثوں کو جو ہر لحاظ سے تنقید کے معیار پر پوری اُتریں، شامل کیا جائے۔ امام صاحب کا یہی سب سے بڑا امتیاز اور ان کی اوّلیت ہے کہ اُنھوں نے اعلا اصولوں اور صحت

---

[1] ایسی حدیثوں کو اصطلاح میں ثلاثیات کہا جاتا ہے۔ اس کو سند عالی بھی کہتے ہیں اور یہ ہر اعتبار سے امتیازی اور اہم سمجھی گئی ہیں۔

کے بلند ترین معیار کو سامنے رکھ کر وہ مجموعہ تیار کیا جسے اُمتِ مسلمہ نے متفقہ طور پر "اصح کتاب بعد کتاب اللہ" (اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب) تسلیم کیا۔ صحیح بخاری کی مقبولیت کے سلسلے میں ابو زید مروزیؒ کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے، کہتے ہیں کہ میں ایک دن حرم میں سو رہا تھا کہ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، حضور فرما رہے تھے کہ تم ہماری کتاب کیوں نہیں پڑھتے، میں نے پوچھا حضور کی کتاب کون سی ہے، فرمایا صحیح بخاری [1]

جب امام بخاری نے اس کی ترتیب مکمل کر لی تو امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) اور علی بن المدینی (۲۳۴ھ) کے سامنے پیش کیا، یہ لوگ امام صاحب کے اساتذہ میں سے تھے، ان لوگوں نے اس کام کی تعریف کی اور اس کی صحت و افضلیت کا اعتراف کیا، شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ جو شخص صحیح بخاری کی عظمت کا قائل نہ ہو وہ مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بخاری شریف کے پڑھنے سے بہت سے فائدے ہیں، قحط سالی دور ہوتی ہے اور اس کی برکت سے بارش ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اس کے بار بار پڑھنے سے دعائیں مقبول ہوتی ہیں اور کام پورے ہوتے ہیں۔

امام صاحب نے اس کتاب میں صرف صحیح حدیثوں کو شامل

[1] مقدمہ فتح الباری بحوالہ محدثین عظام ص ۱۲۷

کیا ہے، فقہی مسائل کی طرف بھی توجہ رکھی ہے۔ آیات احکام کا بھی خیال رکھا ہے۔ اس سے ایک طرف فقہی مسائل کی توضیح ہوتی ہے دوسری طرف تفسیری و تاریخی نکتے بھی ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب حدیث کے دوسرے مجموعوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بہت سی حدیثوں کی تکرار ملتی ہے یعنی ایک ہی حدیث مختلف ابواب میں نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی حدیث سے مختلف مسائل یا احکام کا پتا چلتا ہے، چونکہ انھوں نے مختلف قسم کے ابواب قائم کیے ہیں اس لیے وہ حدیث جن جن ابواب سے متعلق ہے ان میں اس کا ذکر کرتے ہیں، البتہ اکثر جگہوں پر اس کا خیال رکھا ہے کہ اس کی اسناد مختلف ہوں، ایک ہی حدیث کو مختلف سندوں سے بیان کرنے میں یہ بات بھی ان کے پیش نظر ہے کہ اس سے حدیث کو تقویت ملتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک راوی کسی حدیث کو مختصر طریقے پر بیان کرتا ہے اور دوسرا مفصل، کبھی مختلف راوی ایک ہی حدیث میں الگ الگ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اچھے محدث کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایسی احادیث کے مختلف سلسلوں کو ضرور بیان کرتا ہے تاکہ سننے والے شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہوں اور الفاظ حدیث کے صحیح مفہوم کو سمجھ سکیں اور اس کی تشریح و تنقید آسانی سے کر سکیں۔

امام بخاری نے بعض احادیث کے الگ الگ حصے مختلف ابواب میں پیش کیے ہیں اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بہت سی احادیث ایسی ہیں جن کے

الفاظ سے الگ الگ مسائل اور احکام مستنبط ہوتے ہیں، اسی لیے امام صاحب نے ایسی احادیث کے حصے مختلف سندوں سے الگ الگ ابواب میں بیان کر دیے" تاکہ ان سے ایک طرف تو متعدد اسناد کا پتا چل جائے اور دوسری طرف اس کے متعدد مفہوم بھی معلوم ہو جائیں۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ بعض جگہوں پر اس کی ترتیب میں بے ربطی اور ابواب میں خامی نظر آتی ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگرچہ کتاب سولہ سال کی مدت میں تمام ہوگئی تھی مگر نظرثانی اور اضافے کا سلسلہ اخیر دم تک جاری رہا۔ بعض مقامات پر امام ممدوح نے اضافہ کرنا چاہا تھا مگر اس کا موقع نہ مل سکا، چنانچہ کہیں باب قائم کر لیا تھا مگر اس کے تحت حدیث درج کرنے کی نوبت نہ آئی، کہیں حدیث لکھ لی تھی مگر باب قائم نہ کر سکے تھے، بہرحال کتاب کے بہت سے مقامات اسی طرح تشنۂ تکمیل ہی تھے کہ امام بخاری نے اس دارفانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ بعد کو ناسخین نے اپنی صوابدید کے مطابق جن ابواب میں چاہا ان حدیثوں کو نقل کر دیا۔" [1]

[1] ابن ماجہ اور علم حدیث، ص ۲۱۳

حدیث کی صحیح ترین کتابیں چھ سمجھی جاتی ہیں جنھیں "صحاح ستہ" کہتے ہیں، مگر ان میں بھی دو کتابیں زیادہ قابل اعتبار اور صحیح تسلیم کی گئی ہیں: (۱) صحیح بخاری اور (۲) صحیح مسلم۔ عام طور سے ان کو صحیحین کہا جاتا ہے، لیکن علماء نے ان دونوں میں بخاری کو اصح مانا ہے اور اس کی وجوہات یہ بیان کی ہیں کہ یہ اپنے انداز کی پہلی تصنیف ہے، چونکہ امام بخاری کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا اس لیے ان کو اولیت کا شرف حاصل ہے، امام مسلم کے سامنے نقش اوّل موجود تھا اس میں جو معمولی قسم کی خامیاں رہ گئی تھیں وہ ان سے بچ گئے۔ امام بخاری نے اس کا التزام کیا کہ صرف صحیح حدیثوں کو جمع کریں اور ان کی ترتیب فقہی مباحث کے پیش نظر کی۔ اس سلسلے میں کسی کسی باب میں آیات قرآنی پیش کر کے استدلال کیا ہے اور حدیثیں جمع کی ہیں، اس سے تحقیق مسائل میں بھی بہت مدد ملتی ہے۔ امام بخاری نے کچھ ایسی احادیث بھی پیش کی ہیں جن سے اس زمانے کی معاشرت کا بھی پتا چلتا ہے۔ بعض جگہوں پر ایک ہی حدیث سے مختلف نتائج نکالے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ کی لونڈی بریرہؓ کو کسی نے گوشت صدقے کے طور پر دیا۔ حضرت عائشہؓ نے وہ گوشت رسول اللہ صلعم کو یہ کہہ کر نہیں دیا کہ یہ صدقے کا ہے اور آپ صدقہ نہیں کھاتے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ بریرہؓ کے لیے صدقہ ہے لیکن اگر وہ مجھے دے دے تو یہ میرے لیے ہدیہ ہوگا۔ امام بخاری نے اسے مختلف ابواب میں نقل کیا ہے، ایک جگہ اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ جن لوگوں پر صدقہ حرام ہے ان کی لونڈیاں صدقہ لے سکتی ہیں، دوسری

جگہ اسی حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کسی کو صدقہ دیا جائے اور وہ اس صدقے کو بطور ہدیہ کسی ایسے شخص کو پیش کرے جس پر صدقہ حرام ہے تو اس کا شمار ہدیہ میں ہوگا صدقے میں نہیں۔ غرض اسی طرح سے اور بھی بہت سی حدیثوں سے الگ الگ نتائج اخذ کیے ہیں۔ بعض لوگوں نے بخاری کی خوبیوں میں حدیث کے ادبی رنگ کو بھی شمار کیا ہے، حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں بخاری میں حدیث کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جو اس کا طرزِ بیان ہے وہ زیادہ سلیس اور ادبی ہے اور خاص طور سے اس زبان کے مطابق ہے جو رسول اللہ صلعم کے زمانے میں یا اس سے قریب کے زمانے میں رائج تھی۔ امام صاحب ان احادیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتے جن کے راویوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ثابت نہ ہو جب کہ دوسرے محدثین کے نزدیک ہمعصر ہونا کافی ہے۔ بہر حال امام صاحب کی محنت، دیانت، احتیاط، صحتِ روایت، اتصال اسناد اور اسی قسم کی بنا پر علماء و نقادانِ حدیث نے بڑی قدر و منزلت کی اور ان کی صحیح کو اصح کتاب بعد کتاب اللہ کا اونچا درجہ دیا۔

صحیح بخاری کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ علماء ہر دور میں اس کی شرحیں اور حواشی لکھتے رہے جن کی تعداد سو سے زائد ہے۔ ان میں سے چند اہم اور مشہور درج ذیل ہیں:

۱۔ **فتح الباری:** اس کے مصنف ابو الفضل احمد بن علی بن حجر متوفی ۸۵۲ھ ہیں۔ یہ کتاب بہت مفصل اور مدلل سمجھی جاتی ہے۔ ابتدا میں بہت تفصیل سے امام بخاری

کے حالات اور علم حدیث وغیرہ سے بحث کی ہے، تشریح و توضیح میں بھی بڑی احتیاط اور توجہ سے کام لیا ہے۔

۲۔ **عمدۃ القاری:** یہ علامہ بدر الدین ابو محمد بن احمد العینی متوفی ۸۵۵ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں مصنفؒ نے فتح الباری سے پوری طرح استفادہ کیا ہے، اور جو باتیں اس میں نہ آسکی تھیں، ان کو بھی بیان کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فتح الباری کا مقدمہ بہت بسوط اور مفصل ہے جس سے فن حدیث کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور عمدۃ القاری کی تشریحات و توضیحات ایسی مدلل اور عمدہ ہیں کہ حدیث کا مطلب اور متعلقہ مسئلہ پوری طرح سمجھ میں آجاتا ہے اور کسی دوسری شرح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے مصنف علامہ عینی فتح الباری کے مصنف ابن حجر سے عمر میں خاصے بڑے اور ان کے اساتذہ کے درجے کے بزرگ تھے۔

۳۔ **ارشاد الباری:** اس کے مصنف احمد بن محمد الخطیب القسطلانی متوفی ۹۲۳ھ ہیں۔

۴۔ **ہدایت الباری:** علامہ زکریا انصاری متوفی ۹۲۸ھ کی تصنیف ہے۔

۵۔ **تیسیر القاری:** علامہ نور الحق بن عبد الحق دہلوی متوفی ۱۰۷۳ھ کی تصنیف ہے، فارسی زبان میں۔

۶- التوشیح علی الجامع الصحیح : علامہ جلال الدین السیوطی متوفی ۹۱۱ھ کی تصنیف ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے شروح و حواشی لکھے رجال بخاری اور متعلقات بخاری پر کام کیا ہے۔ اس کے اختصار بھی بعض لوگوں نے کیے ہیں جو بہت مقبول ہیں۔ عربی کے علاوہ فارسی، اُردو، انگر اور دوسری زبانوں میں بہت سی شرحیں اور ترجمے بھی کیے گئے۔

امام مُسلم ؒ

(ولادت سنہ ۲۰۶ھ ۔ وفات سنہ ۲۶۱ھ)

مُسلم بن حجاج بن مُسلم کی پیدائش نیشاپور میں ہوئی، ان کا سلسلۂ ب عرب کے خاندان بنی قشیر سے ملتا ہے۔ ان کے سنہ پیدائش میں ـتلاف ہے۔ مورخین نے ۲۰۲ھ، ۲۰۴ھ اور ۲۰۶ھ لکھا ہے۔ علامہ ہبی نے[5] ۲۰۴ھ کو صحیح کہا ہے، ابن خلکان اور ابن اثیر نے ۲۰۶ھ لکھا ہے۔ امام مُسلم بڑے ذہین تھے، بچپن ہی سے ان کو علمِ حدیث سے ـلچسپی تھی، نیشاپور اس زمانے میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور ـے بڑے علماء و محدثین وہاں موجود تھے۔ امام مُسلم نے بھی ان مشائخ کی مجالسِ درس سے فائدہ اٹھایا اور پوری توجہ و لگن سے اس مبارک علم کی تحصیل میں لگ گئے۔ نیشاپور کے اساتذہ سے فیض اُٹھانے کے

---

۵ تذکرۃ الحفاظ، ج ۲ ص ۱۶۵

بعد متعدد دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا اور مشہور علماء سے تلمذ کیا۔ ان کے بچپن اور طالب علمی کے حالات کا تفصیل سے پتا نہیں چلتا ہے اور نہ ہی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ابتدائی اساتذہ کون تھے، مورخین نے ان کے اساتذہ میں محمد بن یحییٰ ذہلی، سعید بن منصور، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مسلمہ قعنبی، اسماعیل ابن ابی اویس، عمرو بن سواد وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ تمام اساتذہ مصر، بغداد، بصرہ، حجاز وغیرہ میں تھے اور امام مسلم نے ان لوگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر کسب فیض کیا تھا۔ نیشاپور میں امام بخاری سے بھی فیض اٹھایا تھا۔

امام مسلم سے بے شمار لوگوں نے حدیث کا سماع کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: ابوالفضل احمد بن سلمہ، محمد بن عبدالوہاب، ابو عمرو مستملی، صالح بن محمد، ابراہیم بن ابی طالب، علی بن حسین، ابن خزیمہ، ابو محمد بن ابی حاتم الرازی، ابراہیم بن محمد بن سفیان، ابو عوانہ اسفرائنی، محمد بن اسحاق فاکہی، امام ترمذی وغیرہ۔

امام مسلم اپنے مزاج کے اعتبار سے صلح پسند، ایمان دار، حق گو اور اخلاق و شرافت میں بے مثال تھے۔ غیبت، تعلی اور سب و شتم سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔ شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے:

> "مسلم کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے عمر بھر کسی کی غیبت نہیں کی، نہ کسی کو مارا اور نہ کسی کو گالی دی"۔[۱]

۱۔ بستان المحدثین ص۱۷۱

اپنے اساتذہ کا بے حد ادب و احترام کرتے، امام بخاری کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور ان کے زہد و تقویٰ سے بہت متاثر ہوتے۔ ایک مرتبہ ان کا جذبۂ احترام اتنا بڑھ گیا کہ امام بخاری سے ان کے قدم چومنے کی اجازت چاہی۔[۱] ان کی حق گوئی و بے باکی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب امام بخاری نیشاپور میں تھے تو ان کی مجلس میں بہت سے لوگ شریک ہوتے تھے، خلق قرآن کے سلسلے میں امام بخاری اور امام ذہلی کا اختلاف ہو گیا۔ امام مسلم کو دونوں سے شاگردی کا تعلق تھا اور استاد کا ادب و احترام ان کے یہاں فرض کا درجہ رکھتا تھا، لیکن اس مسئلے میں وہ امام بخاری کے ہمنوا تھے۔ جب امام ذہلی نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص قرآن کے الفاظ کو مخلوق نہ کہے ہماری مجلس میں اس کے لیے آنا حرام ہے تو امام مسلم نے اپنے شاگردانہ تعلقات کی پروا نہ کی اور نہ صرف ان کی مجلس سے اٹھ کر چلے آئے بلکہ ان سے سنی ہوئی روایات کے مسودے بھی ان کو واپس بھیج دیے اور ترکِ تعلق کر لیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اور دوسرے مسائل میں بھی امام بخاری سے متفق تھے، صحیح مسلم کے مقدمے کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سی باتوں میں ان سے شدید اختلاف کیا ہے۔ وہ تقلید بے جا طرفداری اور تعصب سے پاک تھے اور وہی کہتے اور کرتے تھے جسے ان کی عقل اور ان کا دل تسلیم کرتا تھا۔

۱۔ تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص۱۰۲

امام مسلم کے زمانے میں علم حدیث کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ تھی اور یہ توجہ مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی، اس زمانے میں فن حدیث کے بہت سے اساتذہ موجود تھے۔ امام صاحب نے سب ہی سے استفادہ کیا اور جلد ہی وہ وقت بھی آگیا جب ان کا اپنے ہمعصروں میں ایک خاص مرتبہ ہوگیا، بہت سے اساتذہ نے بھی ان کی فضیلت، علمیت، کمال اور اعلا ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور ان سے روایت کی ہے، اسحاق بن راہویہ نے جو علم حدیث کے امام تھے ان کے متعلق پیشین گوئی کی:

"خدا جانے یہ شخص کس شان کا ہوگا"

ان کے اساتذہ اور معاصرین نے ان کے کمالات کو بے حد سراہا اور ہمیشہ قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ ابو عمرو مستملی کہتے ہیں کہ اسحاق بن منصور حدیثیں لکھوا رہے تھے اور امام مسلم ان میں سے انتخاب کر رہے تھے، اچانک امام اسحاق نے نظر اوپر اٹھائی اور فرمایا جب تک مسلم بن حجاج ہمارے پاس ہیں ہم کبھی خیر سے محروم نہ ہوں گے۔ ان کے ایک دوسرے استاد محمد بن عبد الوہاب کہتے تھے کہ مسلم علم کا خزانہ ہیں، ابوبکر جارودی امام مسلم کو علم کا محافظ قرار دیتے تھے۔ امام ابو زرعہ اور ابو حاتم رازی جیسے بزرگ ان کو اس زمانے کے دوسرے شیوخ پر ترجیح دیتے تھے۔

امام مسلم فن حدیث میں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے، حدیث کے کھرے کھوٹے کی پہچان میں ان کو مہارت تھی۔ بعض لوگوں نے امام مسلم کو امام بخاری پر ترجیح دی ہے، اس کی وجہ یہ بیان کی

جاتی ہے کہ امام بخاری کی بہت سی روایتیں اہل شام کی کتابوں سے لی گئی ہیں، خود محدثین کی زبان سے نہیں سنی گئی ہیں[۱]۔ اس لیے ان کے راویوں میں امام بخاری سے کبھی کبھی غلطی ہو جاتی ہے، ایک ہی راوی کہیں اپنی کنیت سے اور کہیں اپنے نام سے آجاتا ہے، امام بخاری اس کو دو الگ الگ اشخاص سمجھ لیتے ہیں، لیکن امام مسلم کے یہاں ایسی غلطی نہیں ہونے پاتی، اس لیے کہ وہ براہ راست خود سنی ہوئی حدیثوں کو نقل کرتے ہیں[۲]۔ اس کے علاوہ امام مسلم نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ اپنی صحیح میں صرف وہ حدیث بیان کریں گے جس کو کم از کم دو ثقہ تابعین نے دو صحابیوں سے روایت کیا ہو اور یہی شرط تمام طبقات تابعین و تبع تابعین میں ملحوظ رکھی ہے، دوسرے یہ کہ وہ راویوں کے اوصاف میں صرف عدالت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ شہادت کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہیں، بخاری کے یہاں اس قدر پابندی نہیں ہے[۳]۔

امام مسلم کی وفات کا سبب بھی ان کے محققانہ مزاج تلاش و جستجو کی عکاسی کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز آپ سے کوئی حدیث دریافت کی گئی، آپ کو اس وقت صحیح طور پر یاد نہ تھی اس لیے نہ بتا سکے، گھر آکر اپنی کتابوں میں اس کی تلاش کرنے لگے۔ کھجوروں کا ٹوکرا قریب ہی رکھا تھا، تلاش حدیث کے ساتھ ساتھ

۱۔ اس کو فن حدیث کی اصطلاح میں مناولہ کہتے ہیں۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۶
۳۔ بستان المحدثین اردو ص ۱۷۱

آپ کھجور بھی کھاتے جا رہے تھے، ان پر کچھ ایسی دُھن اور انہماک و
استغراق طاری تھا کہ یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ کب وہ ٹوکرا خالی ہو گیا،
غیر ارادی طور پر کھجوروں کا اتنی زیادہ مقدار میں کھا جانا ان کی موت
کا سبب بن گیا اور ۲۵ رجب ۲۶۱ھ میں جان جانِ آفریں کے
سپرد کر دی، نیشاپور کے قریب نصیر آباد میں دفن ہوئے، ابو حاتم
رازی کہتے ہیں کہ میں نے امام مسلم کو خواب میں دیکھا اور ان کا
حال پوچھا تو انھوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کو میرے
لیے مباح کر دیا ہے جہاں چاہتا ہوں رہتا ہوں[1]۔

امام مسلم کو حدیث کی تلاش و جستجو اور راویانِ حدیث سے
ملاقات کے لیے مختلف جگہوں کے سفر کرنے پڑے لیکن اس کے
باوجود وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بھی برابر
لگے رہے، ایک طرف ان کے بہت سے شاگردوں کا پتا چلتا ہے
جنھوں نے ان کے نام کو اونچا کیا اور حدیث کی خدمت کی، دوسری
طرف ان کی بہت سی تصانیف کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مؤرخین نے ان
کی مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے:

۱- الجامع الصحیح — ۲- المسند الکبیر
۳- کتاب العلل — ۴- کتاب الجامع علی الابواب
۵- کتاب الوحدان — ۶- کتاب الاسماء والکنی
۷- کتاب الافراد — ۸- کتاب مشائخ مالک

۱۔ بستان المحدثین اردو ص۱۷۹

۹- کتاب مشائخ ثوری — ۱۰- کتاب مشائخ شعبہ
۱۱- کتاب سوالات احمد بن حنبل — ۱۲- کتاب حدیث عمرو بن شعیب
۱۳- کتاب الانتفاع باہب السباع — ۱۴- کتاب المخضرمین
۱۵- کتاب اولاد الصحابہ — ۱۶- کتاب من لیس لہ الا راو واحد
۱۷- کتاب اوہام المحدثین — ۱۸- کتاب طبقات التابعین
۱۹- مسند امام مالک — ۲۰- مسند الصحابہ

امام مسلم کی یہ تمام کتابیں اپنی جگہ پر مفید اور اچھی ہیں، لیکن
ان سب میں جو شہرت اور قبول عام ان کی الجامع الصحیح کو حاصل ہوا
کسی دوسری تصنیف کو نہ ہو سکا۔ صحاح ستہ میں اس کو عام طور سے
دوسرا درجہ حاصل ہے، لیکن بعض علماء نے اسے صحیح بخاری پر ترجیح دی
ہے، حافظ ابو علی حاکم نیشاپوری ان کی اس تصنیف کو حدیث کی تمام
دوسری کتابوں پر ترجیح دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ روئے زمین
پر صحیح مسلم سے بڑھ کر کوئی اور صحیح کتاب نہیں ہے[1]۔ امام نسائی، مسلم بن
قاسم اور ابوبکر اسماعیل وغیرہ بھی مسلم کو زیادہ بہتر قرار دیتے تھے۔
لیکن جمہور امت نے امام بخاری کی صحیح کو امام مسلم کی صحیح پر فوقیت
دی ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ قرار دی ہے کہ جس وقت امام
بخاری نے یہ کام کیا تھا اس وقت ان کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔
اور انھوں نے تمام صحیح روایات کو یکجا کر کے انھیں برباد ہونے سے
بچایا۔ امام مسلم کے سامنے امام بخاری کی صحیح موجود تھی اور ان کو اس

۱۔ تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص۱۲۶، بستان ص۱۸۵

کی خوبیوں اور خامیوں سے فائدہ اُٹھانے کا پورا موقع حاصل تھا۔

امام مسلم نے نہایت تورع اور احتیاط کے ساتھ اپنی سُنی ہوئی تین لاکھ حدیثوں میں سے اپنی صحیح کا انتخاب کیا[1] اپنی ذاتی تحقیق کے علاوہ مزید احتیاط کے پیشِ نظر اس مجموعے میں صرف ان احادیث کو شامل کیا ہے جن پر اس دور کے علماء و محدثین کا اتفاق تھا۔ کتاب کو مکمل کرنے کے بعد آپ نے اسے جرح و تعدیل اور فنِ حدیث کے امام حافظ ابو زرعہ کی خدمت میں پیش کیا، حافظ موصوف نے اس میں سے جن احادیث پر بحث کی نکال دیا۔ تقریباً پندرہ سال کی محنت کے بعد یہ کتاب تیار ہوئی۔ عام طور سے اس کا نام الجامع الصحیح ہے، لیکن بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اس پر جامع کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ جامع اصطلاح میں حدیث کی اس کتاب کو کہیں گے جس میں تفسیری احادیث بھی خاصی تعداد میں موجود ہوں، اس کتاب میں تفسیری احادیث بہت کم ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ امام مسلم تفسیر سے متعلق اکثر روایات کو کتاب کے مختلف حصوں میں بیان کر چکے تھے اس لیے کتاب التفسیر میں ان کو دوبارہ بیان نہیں کیا، دوسرے یہ کہ تفسیری روایات بہرحال موجود ہیں اس لیے اس کو جامع کی صف سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

امام صاحب نے اپنی اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے۔ انھوں نے جس زمانے میں اپنی اس کتاب

[1] بستان المحدثین ص۱۷۵

کو مرتب کیا احادیث موضوعہ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، غالباً یہی وجہ ہے کہ امام صاحب نے اس کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ لکھا جس میں اصول حدیث اور جرح و تعدیل سے متعلق بڑی اہم باتیں پیش کی ہیں۔ کتاب کی ترتیب ابواب کے تحت کی ہے اور ہر باب میں اس سے متعلق احادیث کو جمع کیا ہے۔ امام صاحب نے اپنی صحیح میں حدیث لکھنے کی یہ شرط رکھی ہے کہ تمام راوی عادل، ثقہ، متصل اور علت سے پاک ہوں۔ شیخ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہے ہوں اور ان کا تقویٰ مسلّم ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی خیال رکھا ہے کہ صرف اسی حدیث کو لیں جس کی صحت پر اجماع ہو چکا ہو۔ اگر کوئی حدیث ان کے معیار کے مطابق صحیح ہے اور دوسرے محدثین کے نزدیک مشتبہ تو اسے چھوڑ دیا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس احتیاط کے باوجود کچھ ایسی احادیث شامل ہو گئی ہیں جن کی صحت پر اجماع نہیں ہے۔ اجماع سے امام صاحب کی مراد اجماع امت نہیں بلکہ اس دور کے مشہور شیوخ کا اجماع ہے، ان شیوخ میں امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، عثمان بن ابی شیبہ اور سعید بن منصور کے نام لیے جاتے ہیں۔

انھوں نے رواۃ حدیث کے تین طبقے مقرر کیے ہیں۔ پہلے طبقے میں ان محدثین کا شمار ہے جو دیانت و ثقاہت اور علم و زہد میں اعلا درجے پر ہوں۔ دوسرے طبقے میں ان لوگوں کا شمار ہے جو پہلے درجے کے راویوں سے قدرے کم ہوں اور تیسرے طبقے میں ان کا شمار ہے جن کو عام طور سے مردود اور متہم بالکذب قرار دیا گیا ہو، اپنی

اس کتاب میں انھوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہی حدیث شامل کریں گے جس کے راوی پہلے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں لیکن اگر ضرورت ہوئی تو دوسرے طبقے کی روایتوں کو بھی جگہ دی جائے گی۔ تیسرے طبقے کے سلسلے میں وضاحت سے ذکر ہے کہ ان کی روایات کو ہرگز داخلِ کتاب نہ کریں گے۔ امام مسلم اور امام بخاری دونوں کی کتابیں اپنی صحت و ثقاہت میں درجہ اوّل کی سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے ایسے راوی ہیں جن سے امام بخاری نے روایت کی ہے اور امام مسلم نے نہیں کی یا امام مسلم نے کی ہے اور امام بخاری نے ان کو معتبر قرار نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے جو شرائط ثقاہت کے لیے اپنی اپنی کتابوں میں رکھے تھے ان پر یہ لوگ پورے نہیں اترتے۔ کئی سو ایسے راوی ہیں جو امام مسلم کے یہاں تو موجود ہیں لیکن امام بخاری نے ان سے کوئی روایت نہیں کی ہے، اسی طرح سے ایسے بھی کئی سو ہیں جو امام بخاری کے یہاں موجود ہیں لیکن امام مسلم انھیں اپنی شرائط پر پورا نہیں پاتے اور ان سے کوئی روایت نہیں کرتے۔

صحیح مسلم کی بعض ایسی خوبیاں ہیں جو اس کو احادیث کے دوسرے مجموعوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ امام مسلم تمام حدیثوں کو ایک خاص انداز سے اور مناسب باب کے تحت درج کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ روایات کی مختلف سندوں اور الفاظ کے اختلافات کا ذکر کر دیتے ہیں۔ صحیح مسلم سے استفادہ آسان ہے اس لیے کہ ایک باب سے متعلق

احادیث ایک ہی جگہ مل جاتی ہیں۔ سندِ حدیث میں راویوں کے نام و نسب کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں اس لیے کہ ایک ہی نام کے دو شخص ہو سکتے ہیں۔ امام صاحب ایسی جگہوں پر ابن فلاں کہہ کر اس کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ ان کی مُراد کس شخص سے ہے۔ اسی طرح سے اگر کسی راوی کی کنیت یا نسب میں فرق ہو تو اس کی بھی توضیح کر دیتے ہیں، اس سے امام صاحب کی علمیت اور واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے اور وسعتِ نظر و صداقت کا پتا چلتا ہے۔ حدیث کی چھان بین کے ساتھ ساتھ انھوں نے "حدثنا" اور "اخبرنا" کے فرق کا بھی خیال رکھا ہے۔ عام طور سے اُس زمانے میں تعلیم حدیث کے دو طریقے رائج تھے، ایک تو یہ کہ اساتذہ خود ہی حدیث پڑھتے اور اس کی تشریح اور اس سلسلے میں ضروری گفتگو کرتے جاتے ہیں اسے "حدثنا" سے روایت کرتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ شاگرد پڑھتا اور استاد حدیث سے متعلق مسائل پر گفتگو کرتا، اسے "اخبرنا" سے روایت کرتے۔ اس طریقۂ تعلیم سے حدیث کی صحت پر یا اس کے راویوں پر کوئی حرف نہیں آتا۔ خواہ شاگرد پڑھے اور استاد معانی و مفہوم بیان کرے یا استاد خود ہی پڑھے اور خود ہی تشریح کرے، دونوں باتیں برابر ہیں لیکن فنی اور لغوی حیثیت سے اس سلسلے میں علماء نے بحثیں کی ہیں۔ امام بخاری، امام زہری، امام یحییٰ بن سعید وغیرہ کے نزدیک "اخبرنا" کے بجائے "حدثنا" یا "حدثنا" کے بجائے "اخبرنا" کہہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن امام شافعی، امام اوزاعی، امام نسائی وغیرہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر شاگرد

نے اُستاد سے سُنا ہے تو وہ حدثنا ہی کہہ سکتا ہے اخبرنا نہیں۔
امام مسلم بھی انھی لوگوں سے متفق ہیں اور اپنی صحیح میں اس فرق کی صراحت کرتے گئے ہیں۔ اگر دو راویوں کے الفاظ میں اختلاف ہے خواہ معنی ایک ہی نکلتے ہوں تو وہ دونوں کے الگ الگ الفاظ بیان کرتے ہیں۔ حدیثوں میں صحابہ وتابعین کے اقوال نقل نہیں کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح سے آگے چل کر اقوال صحابہ اور اقوالِ رسول خلط ملط ہو جائیں گے۔ علم حدیث سے چونکہ لوگوں کو بہت دل چسپی تھی اس لیے کچھ ایسے مجموعے تیار ہو گئے تھے جن میں احادیث صرف ایک ہی سند سے روایات کی گئی تھیں، جب بڑے مجموعے مرتب کیے جانے لگے تو سوال یہ اُٹھا کہ اگر ایسے مجموعوں سے کئی روایتیں لی جائیں تو کیا ہر حدیث کے لیے وہی سلسلہ سند بار بار پیش کیا جائے یا ایک ہی مرتبہ پیش کر کے، بعد کی حدیثیں اسی پر محمول کر دی جائیں۔ اس سلسلے میں بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ ایک ہی سند بار بار بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وکیع بن جراح اور یحییٰ بن معین اس خیال کے حامی تھے، دوسری طرف ابو اسحاق اسفرائنی کا خیال تھا کہ یہ بات جائز نہیں ہے بلکہ ہر حدیث کو بیان کرتے وقت اس کی پوری سند بھی بیان کرنی چاہیے۔ امام مسلم بھی ان کی رائے سے متفق تھے۔

یہ ایسی خوبیاں ہیں جنھوں نے مسلم کو بڑی اہمیت وخصوصیت عطا کی اور اسے ایک عمدہ و مستند تصنیف بنا دیا۔ اس میں مشمول مکررات احادیث کی تعداد بارہ ہزار ہے، اگر مکررات حذف کر دیے

جائیں تو حدیثوں کی مجموعی تعداد چار ہزار باقی رہتی ہے۔[١]

صحیح مسلم کے شروح وحواشی تقریباً ہر زمانے میں لکھے گئے۔ بڑے بڑے علماء ومحدثین امام صاحب کی بیان کی ہوئی احادیث کے معانی ومطالب اور مفہوم کی توضیح میں لگے رہے، ان میں سے چند اہم کتابیں یہ ہیں[٢]:

١- المفہم فی شرح غریب مسلم: یہ امام عبدالغافر بن اسماعیل الفارسی (٥٢٩ھ) کی تصنیف ہے۔

٢- شرحِ مسلم: یہ امام ابو القاسم اسماعیل بن محمد اصفہانی (٥٣٥ھ) کی تصنیف ہے۔

٣- المعلم بفوائد کتاب مسلم: ابو عبداللہ محمد بن علی المازنی (٥٣٦ھ) اس کے مصنف ہیں۔

٤- الاکمال فی شرحِ مسلم: مصنفہ قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی (٥٤٤ھ) یہ المعلم کا تکملہ ہے۔

٥- شرحِ مسلم: عماد الدین عبدالرحمٰن بن عبدالعلی مصری (٦٢٤ھ) کی تصنیف ہے۔

٦- المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم: ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی

---

[١] ابن ماجہ اور علم حدیث، ص ٢١٦ [٢] کشف الظنون، ج ١، ص ٥٥٧ و ٥٥٨

(۶۵۶ھ) کی تالیف ہے، یہ صحیح مسلم کی تلخیص و تبویب ہے، اس کے ساتھ ساتھ غریب الفاظ کی تشریح، اعراب کے سلسلے میں بحثیں اور احادیث سے متعلق مسائل کا استنباط اور استدلال بیان کیا ہے۔

۷۔ المنہاج فی شرح مسلم بن حجاج : یہ شرح ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی (۶۷۶ھ) کی ہے۔ یہ شرح بہت زیادہ مقبول رہی ہے۔ امام نووی فرماتے تھے کہ اگر مجھے لوگوں کی بے رغبتی اور کم ہمتی کا خیال نہ ہوتا تو میں صحیح مسلم کی شرح سو جلدوں میں کرتا۔ اس کا اختصار علامہ شمس الدین تونوی (۶۷۳ھ) نے کیا ہے۔

۸۔ شرحِ مسلم : ابو الفرج عیسیٰ بن مسعود الزوادی (۷۴۴ھ) نے اسے تصنیف کیا۔ پانچ جلدوں میں ہے اور مشہور ہے۔

۹۔ الدیباج علی صحیح مسلم : جلال الدین السیوطی (۹۱۱ھ) کی لکھی ہوئی ہے۔

۱۰۔ منہاج الابتہاج : شیخ شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی کی تالیف ہے، آٹھ جلدوں میں تقریباً نصف صحیح کی تشریح ہے۔

۱۱۔ شرحِ مسلم : ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) کی تالیف ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔

امام ابو داوٗدؒ

(ولادت ۲۰۲ھ ۔ وفات ۲۷۵ھ)

ان کا نام سلیمان اور کنیت ابو داوٗد ہے، والد کا نام اشعث بن اسحاق ہے، ان کی پیدائش سجستان میں ہوئی۔ اسی نسبت سے سجستانی کہے جاتے ہیں، ان کا گھرانا متمول و معزز تھا، ابتدائی تعلیم کے بعد امام داوٗد نے علم حدیث کی طرف توجہ کی اور اپنے دور کے مشہور اور جلیل القدر اساتذۂ حدیث سے فیض اٹھایا۔ اس علم کے حصول کے لیے عراق، خراسان، مصر، شام، حجاز اور دوسرے ملکوں کے سفر کیے، ان کے اساتذہ میں احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابو ثور، یحییٰ بن معین، ابو بکر بن ابی شیبہ، مسلم بن ابراہیم، قتیبہ بن سعید وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد میں گزارا اور وہیں اپنی سنن کی تالیف کی۔ جس طرح سے ان کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے ویسے ہی ان کے شاگرد بھی بے شمار

تھے، جن میں ابوعمرو، ابوسعید، ابوبکر محمد بن عبدالرزاق، ابوالحسن علی بن حسن، ابوعیسیٰ اسحاق، ابوعبید محمد بن علی، امام ترمذی، امام نسائی وغیرہ ہیں۔[1]

امام صاحب بڑے اچھے حافظے کے مالک تھے، بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، عبادت و ریاضت میں لگے رہتے تھے۔ شریعت کی پابندی اور سنتِ نبوی کا خاص طور سے خیال رکھتے تھے۔ مزاج میں سادگی اور نرمی تھی۔ اپنے کُرتے کی ایک آستین بہت کشادہ اور دوسری تنگ رکھتے تھے، کسی نے اس کا سبب دریافت کیا تو بولے ایک آستین کشادہ اس لیے رکھتا ہوں کہ اپنی کتاب کے اجزاء اس میں رکھ سکوں اور دوسری بلاضرورت کشادہ رکھنا اسراف ہوگا۔[2] ان کا مزاج اور انداز اپنے استاد امام احمد بن حنبل سے بہت ملتا تھا۔ اس دور کے علماء و مشائخ بھی ان کے علم و فضل کا اعتراف کرتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔ محمد بن اسحاق اور ابراہیم حربی کہتے تھے کہ بہت سے لوگوں نے ان کو امام عصر قرار دیا ہے۔ ابوحاتم نے لکھا ہے کہ ابوداؤد علم حدیث، علم فقہ اور تقویٰ و خدا خوفی میں دُنیا والوں کے امام تھے، علامہ ذہبی نے ان کو عالم باعمل کہا ہے۔[3] امام صاحب کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے تھے، کچھ طلب علم کے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۸
[2] بستان المحدثین اُردو ص ۱۸۱
[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۹

لیے، کچھ صرف آپ کی صحبت کے لیے اور کچھ آپ کی عقیدت مندی میں۔ معاصرین علماء بھی علمی مسائل پر آپ سے گفتگو کرنے کے لیے آتے تھے، ابومحمد احمد بن محمد بن لیث نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مشہور عارف باللہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری ان سے ملنے آئے، امام صاحب بہت خوش ہوئے اور ان کا استقبال کیا۔ حضرت سہل نے ان سے کہا کہ امام صاحب اپنی زبان دکھایئے جس سے آپ حدیثِ رسول بیان کرتے ہیں تاکہ میں اس کو بوسہ دوں۔ امام صاحب نے اپنی زبان باہر نکالی تو انھوں نے بڑی عقیدت سے اسے بوسہ دیا۔[1]

امام صاحب کو بے شمار احادیث یاد تھیں، حدیث کی جرح و تعدیل میں بھی ان کو مہارت تھی، لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ نہ صرف احادیثِ نبوی کے حافظ و امین تھے بلکہ متون و اسناد پر بھی ان کی اچھی نظر تھی۔ امام صاحب کا دور علم حدیث کا روشن دور تھا، بڑے بڑے محدثین اور ائمۂ فن موجود تھے، امام صاحب نے سب سے اپنی امتیازی حیثیت اور جلالت کو تسلیم کرا لیا۔ اس دور کے بہت سے بزرگوں نے ان کو امام المحدثین کہا ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ علماءِ اسلام ابوداؤد کی مدح و توصیف ان کے وفورِ علم حدیث، میں فہم صائب اور ذہن رسا پر متفق ہیں۔ محمد بن مخلد نے لکھا ہے کہ ان کے معاصرین اور اہل زمانہ ان کی امامتِ فن کے معترف تھے۔[2]

[1] تذکرۃ المحدثین سعیدی ص ۲۷۵، بحوالہ تہذیب التہذیب۔
[2] تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۲۸۹

عام طور سے ان کی شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ ہے لیکن فقہ میں بھی ان کو کمال حاصل تھا' اور یہ غالباً ان کے فقہی ذوق ہی کی بنا پر تھا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں احکام و مسائل سے متعلق احادیث جمع کی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تفسیر کے علم سے بھی واقف تھے، تفسیر فقہ اور حدیث کے علاوہ مروجہ علوم سے بھی ان کو خاصی واقفیت تھی۔ امام صاحب کو دنیا اور اس کے لوازمات سے دلچسپی نہ تھی۔ دربار داری اور علماء کی مجلسوں سے بہت بچتے تھے۔

تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز امیر ابو احمد موفق ان کے گھر آئے۔ امام صاحب نے پوچھا کیسے زحمت فرمائی تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ کے پاس تین درخواستیں لے کر آیا ہوں۔ پہلی تو یہ کہ آپ بصرہ تشریف لے چلیں اور وہیں مستقل قیام کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ آپ سے فیض اٹھا سکیں، دوسری یہ کہ میرے بچوں کو سنن کی تعلیم دیں، تیسری یہ کہ میرے بچوں کو باقی طلبہ سے الگ وقت دیں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ پہلی دونوں باتیں مناسب ہیں لیکن تیسری بات ممکن نہیں ہے اس لیے کہ حصول علم میں عام طلبہ اور خلیفہ کی اولاد سب برابر ہیں، ان میں تفریق ممکن نہیں۔ چنانچہ جب امام صاحب نے بصرہ میں درس کی مجلس قائم کی تو خلیفہ کے لڑکے بھی اس میں شریک ہوئے۔ امام صاحب نے اپنی زندگی کے آخری چند سال بصرہ میں گزارے اور وہیں ۲۷۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

امام صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ طلب علم کے لیے سفر میں گزرا اور اس سے جو بچا وہ درس و تدریس میں صرف ہوا لیکن اس

کے باوجود ان کی تصانیف کی تعداد خاصی تھے جن میں کتاب السنن، کتاب المراسیل، کتاب الناسخ والمنسوخ، کتاب المسائل، کتاب الرد علی اہل القدر، کتاب فضائل الانصار، اخبار الخوارج، کتاب التفسیر کتاب نظم القرآن، کتاب فضائل القرآن، کتاب الدعاء، کتاب البعث و النشر وغیرہ ہیں۔

ان سب میں ان کی سنن سب سے مشہور ہے اور فن حدیث میں اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ ٹھیک طور سے تو پتا نہیں چلتا کہ یہ کس سنہ میں مرتب ہوئی لیکن اندازہ ہے کہ ۲۴۱ھ سے پہلے مرتب ہو گئی تھی، اس لیے کہ امام ابوداؤد نے اسے مرتب کر کے امام احمد بن حنبل کے سامنے پیش کیا تھا اور انھوں نے اس کی تعریف کی تھی[1] امام حنبل کا انتقال ۲۴۱ھ میں ہوا۔ انھوں نے اپنی سنن کی چار ہزار آٹھ سو احادیث کا انتخاب پانچ لاکھ حدیثوں سے کیا۔ ان کی سنن کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں صرف سنن و احکام کی روایات ہیں۔ اس سے پہلے ایسی کتابیں مرتب کرنے کا رواج نہ تھا، اس خصوصیت کی بنا پر بہت جلد اس کی اہمیت ہو گئی، اور علمائے امت نے اسے بہت مفید اور ضروری کتاب قرار دیا۔ عام طور سے صحیح حدیث ہی کا انتخاب کیا ہے، کمزور حدیثوں کو اگر اتفاق سے کسی خاص مسئلے میں لیا ہے تو ان کے ضعف یا علت کو بیان کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی روایت دو طریقوں سے مروی ہے تو دونوں

۱۔ بستان المحدثین صہ ۱۸۱

کا ذکر کر دیتے ہیں۔ طویل حدیثوں کو مختصر کرتے ہیں تاکہ اس کے مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ کبھی کبھی ایک حدیث مختلف سندوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اگر کسی حدیث میں مرفوع یا موقوف کا اختلاف ہو تو اس کا ذکر کرتے ہیں، ایسے راویوں سے کوئی حدیث نہیں لیتے جو متروک ہیں، کبھی کبھی راویوں کے نام کے ساتھ ان کے القاب یا کنیت کو بھی بیان کرتے ہیں۔ عام طور سے تکرار سے احتراز کیا ہے اگر کسی حدیث کی تکرار کی ہے تو اس کے متن یا سند میں کسی کمی یا زیادتی کے پیش نظر کی ہے۔

سنن ابی داؤد کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے، بہت سے علماء نے اس کو بخاری و مسلم کے بعد کا درجہ دیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن مجید اسلام کی اصل اور بنیاد ہے اور سنن ابی داؤد اس کا ستون۔ ابن الاعرابی کا خیال ہے کہ کتاب اللہ اور سنن ابی داؤد کے بعد کسی اور چیز سے واقفیت کی ضرورت نہیں۔ امام خطابی کہتے ہیں کہ سنن ابی داؤد عمدہ اور نفیس کتاب ہے، علوم دینی میں ایسی بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی۔ تمام لوگوں میں اسے حسن قبول حاصل ہوا اور وہ اہل علم اور فقہاء کے مختلف طبقات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، اس میں ہر ایک کی آسودگی کا سامان موجود ہے۔ اکثر ملکوں کے لوگوں کا اس پر اعتماد اور دارومدار ہے۔[1]

امام صاحب نے خود اپنی سنن کے متعلق لکھا ہے۔

[1] تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۲۹۳

"سنن میں چار ہزار آٹھ سو احادیث ہیں، جو سب صحیح یا صحیح کے قریب ہیں، میں نے اپنے علم و یقین بھر اصح روایتیں نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور جو حدیثیں سند کے اعتبار سے اعلا درجے کی ہیں ان کو ترجیح دی ہے۔ مرسل حدیثیں اس وقت نقل کرتا ہوں جب مسند اور متصل روایتیں نہیں ملتیں۔ کیوں کہ ایسی احادیث اہم ائمہ کے نزدیک لائق حجت رہی ہیں ... منکر اور ضعیف سند والی روایتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا البتہ صحیح روایات نہ ملنے کی شکل میں ان کی خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کو نقل کر دیا ہے۔"[1]

امام صاحب نے لکھا ہے کہ میرے اس مجموعے میں چار احادیث ایسی ہیں جو دین پر عمل کرنے کے لیے کافی ہیں:

۱۔ انما الاعمال بالنیات	اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔
۲۔ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ	کسی شخص کے اچھے مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ بے فائدہ کاموں کو چھوڑ دے۔
۳۔ لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ	کوئی شخص اس وقت تک مکمل طور پر مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند

[1] بحوالہ تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۲۹۶، ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۲۲

کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۴- الحلال بین والحرام بین وبینھما مشتبھات فمن اتقی الشبھات استبراء لہ بینہ

حلال اور حرام دونوں ظاہر ہیں اور ان کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں، پس جو شخص مشتبہات سے بچتا رہے، اس نے اپنے دین کو محفوظ کرلیا۔

شاہ عبدالعزیز امام صاحب کے قول کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"ان کے کافی ہونے سے یہ مراد ہے کہ شریعت کے قواعد کلیہ مشہورہ معلوم کرنے کے بعد جزئیات مسائل میں کسی مجتہد یا مرشد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مثلاً عبادات کی دُرستی کے لیے پہلی حدیث، عمرِ عزیز کے اوقات کی حفاظت کے لیے دوسری حدیث، حقوق ہمسایہ و سلوکِ اقارب و اہلِ تعارف و معاملے کی رعایت کے لیے تیسری حدیث، اور اُن شکوک کے ازالے کے لیے جو اختلافِ علماء یا دلائل کے منتخب ہونے سے پیش آتے ہیں چوتھی حدیث کافی ہے۔ گویا مردِ عاقل کے لیے یہ چار حدیثیں اُستاد و پیر کا درجہ رکھتی ہیں۔"[۱]

امام صاحب کی یہ کتاب خاص و عام میں مقبول رہی اور ہر مسلک کے لوگوں نے اسے درس میں شامل رکھا۔ حسن بن محمد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک خواب میں رسول اکرمؐ کی زیارت کی۔ آپؐ

---

[۱] بستان المحدثین اُردو صـ۱۸۲

نے فرمایا جو شخص سنن کا علم حاصل کرنا چاہتا ہو اسے سنن ابی داؤد پڑھنا چاہیے۔ امام غزالی کا خیال ہے کہ علم حدیث میں یہی ایک کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ جو شخص فقہ میں دل چسپی رکھتا ہو اس کو سنن ابی داؤد کا مطالعہ اچھی طرح سے کرنا چاہیے کیونکہ تمام ضروری مسائل جن احادیث سے ثابت ہوتے ہیں وہ سب نہ صرف اس میں جمع کردی گئی ہیں بلکہ ان کی تلخیص و تہذیب اس طرح سے کی گئی ہے کہ ان سے احکام کو سمجھنا آسان ہوگیا ہے۔

سنن ابی داؤد کو ان کے متعدد شاگردوں نے امام صاحب سے روایت کیا ہے، لیکن ان میں سے چار زیادہ مشہور ہیں:

۱- ابو علی محمد بن احمد بن عمر دلؤلؤئی (۳۲۱ھ) انھوں نے سنن کو امام صاحب سے ۲۷۵ھ میں سماع کیا تھا، امام صاحب نے آخری بار اس کا املا اسی سنہ میں کرایا تھا۔ پھر اسی سال ان کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح سے یہ نسخہ آخری سمجھا جاتا ہے اور اسی لیے زیادہ معتبر اور مستند ہے۔

۲- ابوبکر محمد بن عبدالرزاق داسہ (۳۴۵ھ) ان کا نسخہ لؤلؤی کے نسخے سے بڑی حد تک ملتا ہے، البتہ کہیں کہیں کچھ احادیث آگے پیچھے ہوگئی ہیں۔ حدیثوں کی تعداد دونوں میں برابر ہے۔ بعض علماء انئی نسخے کو زیادہ قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔

۳- حافظ ابوعیسٰی اسحٰق بن موسٰی بن سعید رملی (۳۱۷ھ) ان کا نسخہ

---

[۱] بستان المحدثین اُردو، صـ۱۸۳

ابن داسہ کے نسخے سے ملتا ہے۔

۴۔ حافظ ابو سعید احمد بن محمد بن زیاد معروف بہ ابن الاعرابی (۳۴۰ھ) ان کا نسخہ دوسرے نسخوں سے کافی مختلف ہے، بہت سی حدیثیں مختلف ابواب میں کم ہیں اور بعض ابواب ہی درج نہیں ہیں مثلاً کتاب الفتن والملاحم، کتاب الحروف، کتاب الخاتم وغیرہ سرے سے موجود نہیں ہیں۔ کتاب اللباس، کتاب الوضوء، کتاب الصلوٰۃ وغیرہ میں بہت سی حدیثیں کم ہیں۔[1]

سنن ابی داؤد کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر ہر زمانے کے علماء و محدثین نے اس کی شرحیں لکھیں، حواشی مرتب کیے اور اختصار بھی کیے۔ ان میں سے چند کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ **معالم السنن**: اس کے مصنف ابو سلیمان احمد بن محمد بن ابراہیم خطابی (۳۸۸ھ) ہیں۔ یہ سب سے قدیم، ممتاز اور مشہور شرح ہے۔ چونکہ یہ بہت مبسوط تھی اس لیے حافظ شہاب الدین ابو محمود احمد بن محمد مقدسی (۷۶۵ھ) نے اس کا خلاصہ لکھا اور اس کا نام عجالۃ العالم من کتاب المعالم رکھا۔

۲۔ **شرح سنن ابی داؤد**: اس کے مصنف قطب الدین ابو بکر بن احمد الشافعی (۷۵۲ھ) ہیں۔ یہ شرح چار ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳۔ **شرح سنن ابی داؤد**: اس کے مصنف ابو زرعہ احمد بن عبدالرحیم عراقی (۸۲۶ھ) ہیں۔ بہت تفصیل سے اسے مکمل کرنا چاہتے

---

[1] مقدمہ غایت المقصود۔ بحوالہ تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۲۹۹

تھے مگر پورا نہ کر سکے۔ سجدۂ سہو تک کی شرح سات جلدوں میں ہے، اگر مکمل ہوتی تو اندازہ ہے کہ چالیس جلدیں ہوتیں۔

۴۔ **شرح سنن ابی داؤد**: اس کے مصنف بدرالدین عینی (۸۵۵ھ) ہیں۔

۵۔ **مرقاۃ الصعود**: یہ حافظ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) کی شرح ہے۔

۶۔ **شرح نووی**: اس کے مصنف ابو زکریا محی الدین بن شرف نووی (۶۷۶ھ) ہیں۔ یہ بڑے اچھے شارح اور مشہور محدث تھے۔ انھوں نے صحیح مسلم کی بھی شرح کی ہے۔

۷۔ **شرح ابن ارسلان**: اس کے مصنف ابو العباس احمد بن حسین املی مقدسی (۸۴۴ھ) ہیں، یہ ابن ارسلان کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ انھوں نے ابوداؤد کی مفصل اور جامع شرح کی۔

۸۔ **شرح ابن قیم**: شمس الدین محمد بن ابو بکر قیم جوزی (۷۵۱ھ) کی اس شرح کو اچھا تسلیم کیا گیا ہے۔ بعض احادیث پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

۹۔ **غایۃ المقصود**: اس کے مصنف مولانا شمس الحق عظیم آبادی ہیں، یہ ۳۲ جلدوں میں ہے، جس میں سے غالباً دو ہی ایک جلدیں شائع ہو سکی ہیں۔ یہ بہت ہی مفصل شرح ہے اور جن علماء نے اسے دیکھا ہے اس کی تعریف کی ہے۔ اس کا خلاصہ عون المعبود کے نام سے خود انھوں نے مختلف علماء کی مدد سے کیا۔[1]

---

[1] تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۳۰۱ تا ۳۰۴

۱۰۔ **بذل المجہود:** مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی تصنیف ہے۔ پہلے ہندستان میں چھپی تھی۔ اب مصر سے بیس جلدوں میں شائع ہوگئی ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے اس سے متعلق کتابیں لکھی ہیں۔ اور اس کی اہمیت و افادیت کو بڑھایا ہے۔

امام ترمذیؒ

(ولادت ۲۰۹ھ۔ وفات ۲۷۹ھ)

امام ترمذی کا نام محمد اور کنیت ابوعیسیٰ ہے۔ ۲۰۹ھ میں بلخ کے شہر ترمذ میں پیدا ہوئے۔ اسی لیے ترمذی مشہور ہوئے۔ عام طور سے خود انھوں نے اپنے نام کے بجائے اپنی کنیت ابوعیسیٰ کو زیادہ استعمال کیا ہے۔ اپنی جامع میں جہاں بھی اپنا ذکر کیا ہے قال ابوعیسیٰ لکھا ہے۔ امام ترمذی نے کہاں اور کن لوگوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کی تفصیل نہیں ملتی لیکن اس زمانے میں خراسان اور ماوراءالنہر کا علاقہ اپنے علماء و مشائخ کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ بھی اپنی علمی تشنگی دور کرنے کے لیے ان علاقوں میں رہے اور عراق وحجاز وغیرہ کا بھی سفر کیا۔ علم حدیث سے لگاؤ تھا۔ اس لیے شروع ہی سے اس طرف توجہ دی اور اس دور کے اہم علماء و محدثین سے فیض اٹھایا۔ ان کے

اساتذہ میں ابراہیم بن عبداللہ ہروی، اسماعیل بن موسیٰ اسدی، علی بن حجر، قتیبہ بن سعید، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داؤد کے نام شامل ہیں[1]۔ امام بخاری سے بالخصوص انھوں نے بہت استفادہ کیا تھا، امام بخاری بھی ان کی علمیت و فضیلت کی وجہ سے ان کو بہت مانتے تھے۔

امام ترمذی کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ان میں ہیثم بن کلیب شاشی، احمد بن یوسف نسفی، محمد بن محبوب المروزی، داؤد بن نصر، محمد بن منذر ابن سعید ہروی وغیرہ ہیں۔ امام ترمذی سے ان کے استاد امام بخاری نے بھی دو حدیثیں روایت کی ہیں اور اسی بنا پر لوگوں نے امام بخاری کو ان کے اساتذہ اور شاگرد دونوں فہرستوں میں شمار کیا ہے۔

امام ترمذی بڑے عابد و زاہد اور متقی تھے، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی قوتِ حافظہ سے نوازا تھا۔ اکثر عبادت و ریاضت میں لگے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف اور نرم دلی کی وجہ سے اکثر گریہ وزاری طاری رہتا تھا اور اسی میں آخر عمر میں ان کی بینائی ختم ہو گئی تھی[2]۔ امام بخاری اگرچہ ان کے اُستاد تھے لیکن ان سے اتنا متاثر تھے کہ ان سے کہتے تھے کہ میں نے تم سے جتنا استفادہ کیا ہے تم نے مجھ سے اتنا نہیں کیا۔ امام ترمذی کے شوقِ تلاش و جستجو نے ان کو اس دور کا امام بنا دیا تھا۔ ان کے علم و

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص۲۰۷ [2] بستان المحدثین اُردو، ص۱۸۵

کمال پر بڑے بڑے علماء و محدثین کا اتفاق ہے۔ علامہ ذہبی اور ابن حجر عسقلانی نے ان کا شمار ائمۂ محدثین میں کیا ہے اور ان کو امام بخاری کا جانشین قرار دیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام بخاری کے بعد خراسان میں کوئی شخص بھی علم و ورع میں ابو عیسیٰ جیسا نہ تھا۔

امام ترمذی کا حافظہ غیر معمولی تھا، ایک مرتبہ سُن کر عام طور سے ان کو حدیث یاد ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بہت سے تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے جسے امام ترمذی خود یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک شیخ سے میں نے ان کی احادیث کے دو جزو نقل کیے لیکن انھیں سنا نہ سکا تھا، اتفاق سے ایک بار مکہ جاتے ہوئے ان شیخ سے ملاقات ہو گئی، میں نے شیخ سے درخواست کی کہ آپ ان حدیثوں کو پڑھیں تاکہ میں اپنی نقل کی ہوئی حدیثوں سے ان کا موازنہ کر لوں۔ شیخ راضی ہو گئے۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے ان اجزاء کو اپنے سامان میں بہت تلاش کیا مگر وہ نہ مل سکے۔ چونکہ وہ حدیثیں مجھے یاد تھیں اور محض احتیاط کی خاطر میں دوبارہ شیخ سے سُن کر مقابلہ کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے کچھ سادہ کاغذ اپنے ہاتھ میں لے لیے اور شیخ سے قراءت کی درخواست کی، شیخ پڑھتے جاتے تھے اور میں اپنے ذہن میں ان احادیث کو محفوظ کرتا جاتا تھا۔ اتفاق سے شیخ کی نظر سادہ کاغذ پر پڑ گئی وہ بہت خفا ہوئے اور غصے سے فرمایا کہ مجھ سے مذاق کرتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے لکھے ہوئے اجزاء کے نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً ایسا کرنے کا قصہ سُنا کر معذرت کی اور کہا کہ آپ سے نقل کیے ہوئے اجزاء میرے ذہن میں پوری

طرح محفوظ ہیں۔ اس پر شیخ نے ان کو سُنانے کا حکم دیا تو میں نے وہ تمام احادیث سنادیں۔ شیخ کو بہت تعجب ہوا اور یقین نہ آیا کہ ایک بار ہی سن کر یہ سب حدیثیں کیوں کر یاد ہوگئیں۔ امام صاحب نے ان کے اس تعجب کو دور کرنے کے لیے ان سے کہا کہ آپ میرا امتحان لے لیجیے۔ شیخ نے چالیس ایسی احادیث پڑھیں جو صرف ان سے روایت کی جاتی تھیں۔ امام ترمذی نے ان احادیث کو بھی اسی صحت و ترتیب کے ساتھ سُنادیا۔ شیخ ان کے ذہن اور اچھی یادداشت سے بہت خوش اور متاثر ہوئے[۱]۔ ایسے اور بھی بہت سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

امام صاحب نے جس دَور میں عقل و خرد کی آنکھیں کھولی تھیں اُس وقت ہر طرف حدیث کا ذوق و شوق عام تھا، قدرتی طور پر ان کی بھی توجہ اسی فن کی طرف ہوئی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو علم تفسیر سے بھی فطری لگاؤ تھا۔ فقہ سے بھی ان کو خاص دلچسپی تھی۔ علم تفسیر میں ان کی سمجھ بوجھ کا اندازہ ان احادیث اور آثار سے ہوتا ہے جو انھوں نے ابواب تفسیر میں قرآنی آیات کے سلسلے میں جمع کی ہیں۔ ان کے فقہی ذہن اور استنباط مسائل کے سلسلے میں لوگ ان کی جامع کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں جسے صرف احادیث ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فقہی کتاب بھی کہا جاتا ہے، جس میں مختلف ائمہ کے مذاہب و دلائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔

[۱] بستان المحدثین ص۱۸۵، تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص۲۰۹

امام ترمذی غیر مقلد اور مجتہد تھے، بعض لوگوں نے انھیں شافعی یا حنبلی لکھا ہے لیکن یہ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اس شبہے کی وجہ عام طور پر یہ سمجھی جاتی ہے کہ انھوں نے بعض مسائل میں ان ائمہ کے خیالات کی تائید کی ہے، لیکن یہ بہت کمزور سی دلیل ہے اس لیے کہ جب بھی کوئی شخص اپنے اجتہاد و تحقیق کے بعد رائے دے گا تو وہ کبھی کسی کے مطابق ہوگی اور کبھی کسی کے مخالف۔ اب اگر اس کی رائے کسی کی رائے کی تائید کر دے تو اسے مقلد کہنا کچھ غیر مناسب سی بات ہے۔ دوسرے یہ کہ اِنھی لوگوں کی مخالفت بھی امام ترمذی نے بعض مسائل میں کی ہے[۱]۔

ترمذی کی نسبت سے دو اور لوگوں کی شہرت ہے اور کبھی کبھی لوگ اس نسبت کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں، ان میں سے ایک کا نام ابوالحسن احمد ترمذی (۲۴۰ھ) ہے، یہ ترمذی کبیر کے لقب سے مشہور ہیں، احمد بن حنبل کے شاگردوں میں سے تھے، بڑے پائے کے محدث تھے، امام بخاری، امام ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ ان کے شاگرد تھے[۲]۔ دوسرے کا نام ابوعبداللہ محمد بن علی بن حسن الحکیم الترمذی (۲۵۵ھ) ہے، ان کی کتاب نوادر الاصول فی معرفۃ اخبار الرسول بہت مشہور ہے، عام طور سے علما نے اسے غیر معتبر قرار دیا ہے، یہ نبوت پر ولایت کی فضیلت کے قائل تھے، ان کے اس عقیدے کی وجہ سے

[۱] تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص۳۲۲

[۲] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص۱۱۷

ان کو ترمذ سے نکال دیا گیا تھا۔[۱] نوادر الاصول کی اکثر حدیثوں کی نسبت ابو عیسیٰ ترمذی کی طرف لوگ غلطی سے کر دیتے ہیں اس لیے ان کے ناموں کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے، تاکہ غلطی سے محفوظ رہا جا سکے۔

آپ نے ستّر سال کی عمر پائی، ۲۷۹ھ میں ترمذ میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔[۲] اس دور کے رواج کے مطابق امام صاحب زیادہ وقت درس و تدریس اور عبادت و ریاضت میں صرف کرتے تھے لیکن اس کے باوجود مورخین کے بیان کے مطابق انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جامع ترمذی، کتاب العلل، کتاب التاریخ، کتاب الزہد، کتاب الاسماء والکنیٰ، کتاب شمائل النبویہ وغیرہ مشہور ہیں۔

امام صاحب کی جامع کو لوگوں نے بہت پسند کیا، اس سے پہلے دوسرے بہت سے مجموعے تیار ہو چکے تھے، اس لیے جب امام صاحب نے اس کی تصنیف کی تو انھوں نے اپنی راہ الگ نکالی اور اس بات کی کوشش کی کہ ان کی کتاب میں کچھ ایسی خاص باتیں پیدا ہو جائیں جو دوسری کتابوں میں نہیں تھیں۔ ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور ان کی کتاب میں بعض ایسی چیزیں لوگوں کو نظر آئیں جو ان سے پہلے نہ ملتی تھیں اور ان کی کتاب کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں اس کی تالیف سے فارغ ہوا تو اسے پہلے علمائے حجاز کی خدمت میں پیش کیا، انھوں

[۱] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۲۱۵ [۲] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۲۱۵، اتحاف النبلاء ص ۳۸۷

نے بہت پسند کیا، پھر علمائے عراق کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے بھی دادِ تحسین دی، پھر علمائے خراسان کو دکھایا تو انھوں نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جب تمام علماء اس سے متفق ہو گئے تو اسے عام طرح سے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔[۱]

امام صاحب کی جامع محدثین کے نزدیک متفقہ طور پر صحاح ستہ میں شمار ہوتی ہے۔ البتہ مختلف لوگوں نے صحاح ستہ میں اسے تیسرے چوتھے یا پانچویں نمبر پر رکھا ہے، عام طور پر اس کی خوبیوں میں حسنِ ترتیب افادیت اور جامعیت کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ امام صاحب نے خود اس کی تعریف کی ہے کہ جس کے گھر میں یہ کتاب ہو وہ یوں سمجھے کہ اس کے گھر میں نبی کلام کر رہا ہے۔[۲] حافظ ابن اثیر جامع الاصول میں لکھتے ہیں کہ جامع ترمذی کتب صحاح میں سب سے زیادہ احسن ہے کیوں کہ اس کی افادیت اور ترتیب سب سے عمدہ ہے نیز اس میں تکرار بہت کم ہے، مذاہب ائمہ اور وجوہ استدلال کے ذکر اور انواع حدیث اور احوال رواۃ کے بیان میں یہ کتاب منفرد ہے۔ شیخ ابو اسماعیل ہروی نے لکھا ہے کہ اس کتاب سے فقہا، علما اور محدثین یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حدیث صحیح کو قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوتا ہے، حدیث کے صحیح ہونے کی بنیاد رواۃ اور سلسلۂ سند پر ہوتی ہے۔ اصولِ حدیث میں اصحاب صحاح کم و بیش مندرجہ ذیل شرائط پر متفق ہیں:

[۱] بستان المحدثین، ص ۱۸۶ [۲] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۲۰۵

(۱) راوی کا مسلمان ہونا۔ (۲) عقل و سمجھ کا دُرست ہونا۔
(۳) سچا ہونا (۴) عدالت مع جملہ شرائط (۵) حفظ۔
(۶) ضبط (۷) عدم وہم (۸) سلامت ذہن وغیرہ۔

ان اوصاف میں قدرتی طور پر کمی و زیادتی کا امکان ہے۔ یعنی کسی کے یہاں عدالت، کسی کے یہاں عقل، کسی کے یہاں صداقت وغیرہ میں کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے۔ اسی کی بنیاد پر راویوں کے درجے قائم کیے جاتے ہیں اور پھر ان مراتب کو مدِنظر رکھتے ہوئے حدیث کی حیثیت متعین کی جاتی ہے۔ ائمہ کی رائیں صحیح حدیث کی شرائط میں مختلف ہیں، امام بخاری ایک حدیث کو ہر اعتبار سے درست مانتے ہیں لیکن امام مسلم اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ امام ترمذی نے بھی اپنے اصول و ضوابط کے تحت حدیثوں کو منتخب کیا ہے۔ وہ کبھی کبھی کسی کمزور حدیث کو بھی قبول کر لیتے ہیں لیکن اسے کسی صحیح حدیث کی تائید میں استعمال کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کی خامیوں اور خوبیوں کا بھی ذکر کر دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والا حدیث کے درجے کو سمجھ سکے۔ یہ خصوصیت عام طور سے دوسری کتابوں میں نہیں ملتی ہے۔ ذیل میں ان چند خصوصیات کا ذکر ہے جو جامع ترمذی کو دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے:

۱۔ حدیث بیان کرنے کے بعد ائمۂ مذاہب کے اقوال اور ان کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ مسئلے کے متعلق دوسروں کی رائے کا پتا چل جائے۔

۲۔ ہر حدیث میں راوی کی حیثیت یعنی ضعیف یا قوی اور حدیث کے بارے میں کہ وہ صحیح، حسن، غریب، ضعیف وغیرہ لکھ

دیتے ہیں۔

۳۔ صرف ان احادیث کو لیا ہے جو کسی نہ کسی امام کا مذہب ہوں۔

۴۔ روایات کی تکرار بہت کم ہے، اگر ایک حدیث کئی صحابیوں سے مروی ہے تو اسے کسی ایک صحابی سے روایت کرتے ہیں اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں فلاں فلاں دوسرے لوگوں سے بھی یہ حدیث مروی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اپنی روایت کی وجہ ترجیح بھی بیان کرتے ہیں۔ اس اندازِ بیان کی وجہ سے پڑھنے والے کو کئی فائدے ہوتے ہیں، اوّل تو یہ کہ غیر مشہور روایات علم میں آجاتی ہیں، دوسرے یہ کہ اگر کسی روایت میں کوئی علت یا خامی ہے تو اس کا بھی پتا چل جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر متنِ حدیث میں کوئی کمی یا زیادتی ہوتی ہے تو وہ بھی لکھ دیتے ہیں۔

۵۔ سند بیان کرنے کے بعد وہ حدیث کس قسم کی ہے اس کا ذکر کرتے ہیں یعنی صحیح حسن ضعیف وغیرہ۔

۶۔ اگر کسی حدیث کی سند یا متن میں شبہ ہے تو اسے الگ بیان کرتے ہیں۔

۷۔ بہت سے راوی اپنی کنیت یا کسی نسبت سے مشہور ہوتے ہیں، انھوں نے ایسے لوگوں کے ناموں اور کنیتوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اگر کسی راوی کے نام میں اختلاف ہے تو اس کی بھی توضیح کر دیتے ہیں۔

۸۔ اپنی کتاب میں عنوان قائم کرتے وقت اکثر عنوان کے ساتھ اس

سے متعلقہ مرفوع حدیث ضرور بیان کرتے ہیں۔

۹۔ اگر حدیث میں کوئی نامانوس یا مشکل لفظ آجاتا ہے تو اس کی تشریح کرتے ہیں۔

۱۰۔ کبھی کبھی کسی طویل حدیث کا اختصار کر دیتے ہیں اور وفی الحدیث قصہ "طویلہ" لکھ دیتے ہیں۔

۱۱۔ اگر کبھی دو حدیثوں میں تعارض ہو تو توجیہ و تاویل بیان کرتے ہیں۔

۱۲۔ فقہی حدیثوں میں فقہاء کے مذاہب ان کے دلائل اور اختلافات پر اپنی رائے بھی دیتے ہیں۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے کس امام نے کس مسئلے کا استنباط کیا ہے اور اس میں کیا اختلاف ہے۔ اس سے ائمہ کے اختلافات اور ان کی رائے کا پتا چلتا ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے ترمذی سے فقہی مسائل میں استفادہ بہت آسان ہو گیا ہے۔

مندرجہ بالا خصوصیات نے ترمذی کی علمی، فقہی اور افادی حیثیت کو بہت اونچا کر دیا ہے۔ مختلف مذاہب، ان کی وجوہ استدلال اور اقسام حدیث کی تفصیل کسی دوسرے مجموعے میں اتنی عمدگی سے پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ شیخ ابراہیم بن محمد شافعی کا کہنا ہے کہ امام ترمذی کی جامع تمام حدیثی اور فقہی فوائد اور سلف و خلف کے مذاہب کی جامع ہے۔ مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے۔[1]

۱؎ تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۳۲۸

شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ امام ترمذی نے امام بخاری اور امام مسلم کے بیان کیے ہوئے متون و اسناد کے ابہام کی توضیح کر دی ہے اور ابو داؤد کے طریقے پر فقہی احادیث کو جمع کر کے صحابہ، تابعین اور ائمہ کے مذاہب کو بھی بیان کر دیا ہے اسی کے ساتھ ساتھ احادیث کے مختلف سلسلوں کا بھی ذکر کیا ہے اور حدیث کی حیثیت کا تعین کیا ہے اور راویوں کے ناموں اور کنیت وغیرہ کو بتا کر ان کے اختلافات کو دور کیا ہے۔[1]

شاہ عبد العزیز لکھتے ہیں کہ مجموعی حدیثی فوائد کے لحاظ سے اس کتاب کو تمام کتابوں پر فوقیت دی گئی ہے۔ اول اس وجہ سے کہ اس کی ترتیب عمدہ ہے اور تکرار نہیں ہے۔ دوم اس وجہ سے کہ اس میں فقہا کا مذہب اور اس کے ساتھ ساتھ ہر ایک کا استدلال بیان کیا گیا ہے۔ سوم اس وجہ سے کہ اس میں حدیث کے انواع مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، غریب، معلل وغیرہ کو بیان کر دیا گیا ہے۔ چہارم اس وجہ سے کہ اس میں راویوں کے نام ان کے القاب اور کنیت کے علاوہ ان فوائد کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کا علم الرجال سے تعلق ہے۔[2]

امام صاحب خود بڑے مجتہد اور عالم حدیث تھے، جرح و تعدیل کے فن سے پوری طرح واقف تھے اور اصول حدیث پر بہت اچھی نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی جامع میں کچھ مخصوص اصطلاحات کا

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۳۱ ۲؎ بستان المحدثین، ص ۱۸۵

استعمال کیا ہے جو خود ان کی جدّت ہیں مثلاً :

۱ - فلان ذاھب الحدیث ، اس سے مُراد ہے کہ فلاں شخص کو حدیث یاد نہیں رہی۔

۲ - فلان مقارب الحدیث، اس کا مطلب ہے کہ فلاں شخص کی حدیث دوسرے راوی کی حدیث کے قریب ہے۔

۳ - شیخ لیس بذاک، یعنی یہ شخص بڈھا ہے اس کی روایت نامقبول ہے۔

۴ - ھٰذا حدیث جید سے مُراد وہ حدیث ہے جو حدیث صحیح اور حدیث حسن کے بیچ کی ہو۔

اسی طرح سے اور بھی بعض اصطلاحات استعمال کی ہیں ۔ فقہی مسالک میں کہیں کہیں پر اہل الرائے اور بعض اہل الکوفہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے مُراد امام ابوحنیفہ ہیں۔

امام ترمذی کی جامع کو قبولِ عام حاصل ہوا، اور عام طور سے اس کی صحت کو لوگوں نے تسلیم کیا، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے اور بعض لوگ اس کو بخاری و مسلم کے بعد کا درجہ دیتے ہیں۔ بہت سے شعراء نے اس کی تعریف میں قصائد کہے جن میں سے کچھ کے اشعار شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں نقل کیے ہیں[1]۔ اس کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر بہت سے علماء نے اس کی شرحیں اور حواشی لکھے جن میں

---

[1] بستان المحدثین ص ۱۸۵-۱۸۶

عارضۃ الاحوذی محمد بن عبداللہ اشبیلی (۵۴۶ھ) کی، المنقح الشذی ابوالفتح محمد بن محمد شافعی (۷۳۴ھ) کی، قوت المغتذی جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) کی، اور ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) کی شرحیں مشہور ہیں۔

ہندستان کے علماء میں شیخ محمد طاہر گجراتی (۹۸۶ھ) شیخ سراج احمد سرہندی (۱۲۳۰ھ) محمد بن عبدالہادی سندھی (۱۱۳۸ھ) ابوطیب سندھی (۱۱۰۹ھ)۔ مولانا عبدالرحمان مبارک پوری (۱۳۵۳ھ) نے تحفۃ الاحوذی لکھی، الکوکب الدری رشید احمد گنگوہی (۱۳۲۳ھ) کے افادات ہیں جنھیں مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے مرتب کیا اور مولانا محمد زکریا نے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ مولانا انور شاہ کشمیری کے افادات العرف الشذی کے نام سے مرتب ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی بعض لوگوں نے مختلف قسم کے کام کیے ہیں۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کی شمائل کا تذکرہ بھی کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور اعمال مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں اور آپ کا اخلاق، رہن سہن، لباس، اُٹھنے بیٹھنے کے طریقے اسوۂ حسنہ میں داخل ہیں۔ یوں تو آپ کی زندگی کے تمام پہلو احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن امام ترمذی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ خاص اس موضوع پر ایک کتاب مرتب ہونا چاہیے۔ اس خیال کے پیشِ نظر انھوں نے آنحضور صلعم کے حلیۂ مبارک، لباس، سامان، رہن سہن، عادات و اطوار، رفتار و گفتار، اندازِ نشست و برخاست، اخلاق

اور معمولاتِ زندگی سے متعلق جتنی روایتیں ان کو مل سکیں جمع کر دیں۔
اس طرح یہ شمائل رسول اکرم صلعم کی جیتی جاگتی زندگی کی تصویر
پیش کرتی ہے۔ یہ انداز لوگوں کو بہت پسند آیا اور بعد میں اس
قسم کی اور کتابیں بھی مرتب ہوئیں، لیکن امام ترمذی کو اس میدان
میں اوّلیت کے ساتھ ساتھ شرفِ قبول بھی حاصل رہا۔ بعض لوگوں
نے اس کی شرحیں بھی لکھیں۔

امام نسائیؒ

(ولادت ۲۱۵ھ۔ وفات ۳۰۳ھ)

ابو عبدالرحمان احمد بن شعیب کی پیدائش خراسان کے شہر نسا میں
ہوئی، اسی وجہ سے نسائی مشہور ہوئے، ان کا سنہ پیدائش کچھ لوگوں
نے[1] ۲۱۴ھ اور کچھ نے ۲۱۵ھ لکھا ہے، عام طور سے موخرالذکر سنہ
ہی کو صحیح مانا جاتا ہے۔ ان کا وطن نسا، خراسان کے مشہور شہروں
میں شمار ہوتا تھا۔ بہت سے علماء و فضلاء یہاں پیدا ہوئے۔ ان کے
بچپن کے تفصیلی حالات کا ٹھیک سے پتا نہیں چلتا۔ زمانے کے دستور
کے مطابق حصولِ علم کے لیے حجاز، عراق، شام، مصر وغیرہ شہروں کے
اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مستقل سکونت مصر میں اختیار کر لی
تھی، ان کے اساتذہ کی فہرست خاصی طویل ہے جن میں قتیبہ بن سعید،

[1] بستان المحدثین ص ۱۸۹

اسحاق بن راہویہ، محمود بن غیلان، حسین بن منصور، عیسیٰ بن حماد، محمد بن بشار، محمد بن نصر مروزی، امام بخاری اور امام ابوداؤد وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے شاگردوں کا سلسلہ بھی بہت وسیع ہے، اس زمانے میں جن علماء کی شہرت ہو جاتی تھی دور کے شہروں کے لوگ کسبِ علم کے لیے آنے لگتے تھے، ان کی شہرت سن کر بھی بہت سے لوگ ان سے کسبِ فیض کے لیے آئے۔ ان میں ابوبکر احمد بن محمد بن اسحٰق، حسن بن رشیق، ابراہیم بن محمد صالح، ابوالقاسم طبرانی، محمد بن معاویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابوجعفر طحاوی، ابوعوانہ اور آپ کے صاحبزادے عبدالکریم وغیرہ مشہور ہیں۔

امام نسائی بڑے عابد و زاہد تھے، ان کی زندگی پاکیزہ تھی۔ اللہ کا خوف دل پر طاری رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آخرت کی فکر سے پریشان رہتے، سنت کی پوری طرح سے پیروی کرتے تھے اور دین میں بدعت کی روک تھام کی کوشش کرتے تھے۔ عام طور سے ایک دن کے ناغے سے روزہ رکھتے، مزاج میں استغنا تھا اسی لیے امیروں اور حاکموں کی مجلس سے پرہیز کرتے تھے۔ عزم و استقلال، صبر و ضبط اور تحمل مزاج میں رچ بس گئے تھے۔ شجاعت و بہادری کی مثالیں بھی ان کی زندگی میں ملتی ہیں، جہاد کا بھی جذبہ تھا۔ ایک مرتبہ امیرِ مصر کے ساتھ جہاد میں شریک بھی ہوئے[1]

[1] تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۳۷۶

اللہ تعالیٰ نے ان کو دولت سے نوازا تھا اور وہ اُسے خرچ بھی اسی فیاضی سے کرتے تھے، ان کا دسترخوان وسیع ہوتا تھا جس پر طرح طرح کے لذیذ کھانے ہوتے تھے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے، مسلمان قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑایا کرتے تھے۔ اہل بیت اور حضرت علی سے ان کو بہت محبت تھی۔ عمر کے آخری حصے میں مصر سے دمشق گئے، اس وقت وہاں کے لوگ امیر معاویہ کی فضیلت اور شان کے قصیدے پڑھتے تھے اور حضرت علی کے لیے نامناسب جملے استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے حضرت علی کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کے لیے ان کے مناقب پر مشتمل کتاب خصائص علی تصنیف کی اور اسے دمشق کی جامع مسجد میں لوگوں کے سامنے پڑھا۔ چونکہ یہ کتاب وہاں کے لوگوں کی عام رائے کے خلاف تھی اس لیے تھوڑا ہی حصہ سننے کے بعد لوگ بگڑ گئے اور ان سے امیر معاویہ کے فضائل اور برتری بیان کرنے پر زور دینے لگے۔ انھوں نے اس سے انکار کیا۔ اس پر سب خفا ہو گئے اور ان کو بری طرح مارنے پیٹنے لگے، غالباً یہی چوٹیں ان کی موت کا سبب بنیں[1]

مندرجہ بالا واقعے سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ امام صاحب تشیع کی طرف مائل تھے۔ لیکن امام صاحب کی تحریروں سے یا معاصرین سے اس قسم کی کوئی روایت نہیں ملتی ہے، علامہ ذہبی اور ابن حجر عسقلانی وغیرہ نے بھی ایسی کوئی بات نہیں لکھی ہے بلکہ اس کے برعکس اس کا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے فضائلِ صحابہ سے متعلق ایک

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۲۶۸

کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی روایتوں سے استدلال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی سنن میں حضرت عمر کی وہ تقریر نقل کی ہے جو انھوں نے سقیفہ بنو ساعدہ میں کی تھی اور جس میں کہا تھا کہ تم نہیں جانتے کہ حضور صلعم نے حضرت ابوبکر کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا، پھر تم میں سے کون ابوبکر سے مقدم ہونا چاہتا ہے یا بعض جگہوں پر حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان کے بعض فیصلوں کو اپنی رائے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ ان باتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت کے مسلک پر یقین رکھتے تھے۔ محمد بن موسیٰ مامونی کہتے ہیں کہ کچھ لوگ حضرت علی کے فضائل لکھنے اور فضائل شیخین نہ لکھنے کی وجہ سے ابوعبدالرحمٰن نسائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ میں نے ان سے اس مسئلے پر گفتگو کی تو انھوں نے جواب دیا جب میں دمشق گیا تو وہاں کے اکثر لوگ حضرت علی سے منحرف تھے تو میں نے ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کے خیال سے کتاب الخصائص لکھی۔ مامونی کہتے ہیں کہ بعد میں انھوں نے فضائل صحابہ بھی تصنیف کیے[1]

بہرحال امام نسائی کو متفقہ طور پر ائمۂ حدیث کی صفِ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے علماء اور خود ان کے معاصرین نے ان کے علمِ حدیث کا اقرار کیا ہے۔ ابنِ حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ "امام نسائی نقد رجال میں انتہائی محتاط، معتمد اور اپنے تمام معاصرین پر مقدم تھے۔ فن رجال میں ماہرین کی ایک جماعت نے امام نسائی کو

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۲۶

امام مسلم پر بھی ترجیح دی ہے"۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ امام نسائی حدیث، علل حدیث اور اسماء الرجال کے علوم میں مسلم، ترمذی اور ابوداؤد سے زیادہ ماہر تھے[1] ابن خلکان نے ان کو اپنے زمانے کا امام حدیث قرار دیا ہے، ابوسعید عبدالرحمٰن نے "تاریخ مصر" میں ان کو امام حدیث، ثقہ، معتبر اور حافظ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ امام دار قطنی ان کو اپنے زمانے کے تمام محدثین سے اعلا تسلیم کرتے ہیں، ابوعلی نیشاپوری ان کو لاثانی امام حدیث کہتے ہیں۔ علامہ ذہبی نے بہت سے بزرگوں کے اقوال ان کی تعریف و توصیف میں نقل کیے ہیں[2]

امام صاحب کے فقہی مذہب کے بارے میں کچھ لوگوں نے بحثیں کی ہیں، بعض لوگوں نے ان کو شافعی قرار دیا ہے، جن میں علامہ تاج الدین سبکی، شاہ عبدالعزیز اور نواب صدیق حسن خاں شامل ہیں۔ علامہ انور شاہ کشمیری نے ان کو حنبلی لکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے ان کی سنن کی بعض ایسی روایات سے جو حنبلی مذہب کے مطابق ہیں، ان کو حنبلی ثابت کیا ہے، لیکن "تذکرۃ المحدثین" کے مصنف کا خیال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ: "وہ کسی خاص فقہی مسلک کے پابند نہ تھے بلکہ وہ خود فقیہہ و مجتہد تھے اور جزئیات مسائل میں محدثین کی طرح ظواہر احادیث کے مطابق عمل کرتے تھے اور جن ائمہ کے مسلک کو کتاب و سنّت کے زیادہ قریب پاتے تھے اسی کی تائید

[1] بحوالہ تذکرۃ المحدثین سعیدی ص ۲۹۱ [2] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۲۶۶ تا ۲۶۹

فرماتے تھے۔[1]

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے امام نسائی جس دور میں پیدا ہوئے اس میں حدیث اور اس سے متعلقہ علوم سے لوگوں کو بے حد دل چسپی تھی۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں علماء و محدثین حدیث کی تحقیق و تنقید اور علوم حدیث کی تدوین میں مصروف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام نسائی کو بھی اس فن سے خاصی دل چسپی پیدا ہوئی، اور اپنی پوری توجہ سے اس علم کی تحصیل میں لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی قوتِ حافظہ سے نوازا تھا اس لیے ان کو اس علم میں جلد ہی ایک نمایاں مقام حاصل ہوگیا اور اپنے دور کے علماء میں ممتاز ہو گئے۔ ان کے حافظے کا بہت سے لوگوں نے اعتراف کیا ہے، امام صاحب فنِ رجال کے بھی ماہر تھے، ان کا شمار حدیث کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شرائط روایت کو بعض لوگوں نے بخاری و مسلم سے بھی زیادہ سخت قرار دیا ہے۔ حدیث کے کھرے کھوٹے کی پہچان میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ دار قطنی اور حاکم نے لکھا ہے کہ "وہ اپنے معاصرین میں صحیح و سقیم روایات و آثار اور رجال کی معرفت و تمیز میں سب سے زیادہ واقف کار تھے"[2] علم حدیث کے ساتھ ساتھ امام نسائی کو دوسرے مروجہ علوم و فنون میں بھی خاصا کمال حاصل تھا، خاص طور سے قرأت و تفسیر میں ان کو بہت مہارت تھی، فقہی مسائل کے استنباط میں بھی ماہر تھے۔ علامہ ذہبی نے ان کو "افقہ

---

[1] تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۳۷۷ [2] بحوالہ تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۳۷۵

مشائخ مصر" قرار دیا ہے۔[1]

امام صاحب کی بہت سی تصانیف کا ذکر ملتا ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: سنن کبریٰ، المجتبیٰ (سنن صغریٰ کے نام سے مشہور ہے) خصائص علی، مسند علی، مسند مالک، فضائل الصحابہ، اسماء الرواۃ والتمیز بینھم، کتاب الضعفاء، کتاب الجرح والتعدیل وغیرہ۔

امام صاحب نے جب جامع دمشق میں اپنی کتاب خصائص علی کا کچھ حصہ سنایا تھا تو لوگ بہت خفا ہوئے تھے اور آپ کو مارا تھا، ان کو گھر لایا گیا تو آپ نے فرمایا مجھے مکہ لے چلو تاکہ وہیں یا اس کے راستے میں میرا انتقال ہو، مورخین کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ نے مکہ پہنچ کر وفات پائی اور صفا و مروہ کے بیچ میں دفن ہوئے اور بعض کا خیال ہے کہ رملہ میں انتقال ہوا۔ یہ واقعہ ۳۰۳ھ کا ہے۔[2]

امام صاحب کی تمام تصانیف میں ان کی سنن کو ایک خاص درجہ حاصل ہے، انھوں نے پہلے حدیث کی ایک بہت مبسوط کتاب لکھی تھی جس کو سنن کبریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس کو مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اسے امیر رملہ کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا اس میں بیان کی گئی تمام احادیث صحیح ہیں۔ امام صاحب نے جواب دیا نہیں اس میں صحیح اور حسن دونوں قسم کی احادیث موجود ہیں۔ امیر نے کہا کہ آپ اس میں سے میرے لیے وہ حدیثیں منتخب کریں جو بالکل صحیح ہوں۔ امام صاحب نے امیر کی فرمائش پر صحیح حدیثیں منتخب کر دیں،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۲۶۸ [2] بستان المحدثین (اردو) ص ۱۹۰

اس انتخاب کا نام انھوں نے المجتبیٰ رکھا جس کے معنی چنی ہوئی یا منتخب چیز کے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ المجتنیٰ تھا جس کے معنی پکے ہوئے پھل چننے کے ہیں۔ آگے چل کر یہی انتخاب سنن صغریٰ یا سنن نسائی کے نام سے مشہور ہوا اور صحاح ستہ میں شمار کیا گیا۔[1]

بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ تصنیف امام صاحب کی نہیں بلکہ ان کے شاگرد ابن السنی نے اس کا اختصار کیا ہے، حالانکہ یہ بات امیر رملہ کے مندرجہ بالا قصے کے بعد درست نہیں معلوم ہوتی، مولانا عبدالرشید نعمانی نے حافظ ذہبی کے حوالے سے حاشیے پر اس واقعے کو غلط لکھا ہے۔[2] امام صاحب سے ان کی سنن کو ان کے متعدد شاگردوں نے روایت کیا ہے۔ ابن السنی بھی ان میں سے ایک ہیں، ان کے علاوہ امام صاحب کے صاحبزادے عبدالکریم، ابوالحسن علی بن احمد طحاوی محمد بن معاویہ بن الاحمر وغیرہ ہیں۔ اس کی صحت کے بارے میں بہت سے علماء و مشائخ نے گواہی دی ہے اور صحاح ستہ میں شامل کیا ہے۔

امام صاحب نے اپنی سنن میں اپنے اسلاف کی کتابوں کے اندازِ بیان کی پیروی کی ہے، ایک ہی حدیث کو الگ الگ ابواب میں بیان کر کے اس سے مختلف مسائل نکالے ہیں، یہ انداز خاص طور سے انھوں نے امام بخاری سے لیا ہے۔ امام مسلم جس طرح ایک حدیث کے مختلف سلسلوں کو اختلاف الفاظ کے ساتھ ایک جگہ روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے بھی وہی طریقہ اپنی سنن میں اختیار کیا

---

[1] بستان المحدثین (اردو) ص ۱۸۹ [2] ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۲۰

ہے، امام ترمذی کی طرح سے حدیثوں پر فنی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے اور امام ابو داؤد کے انداز پر احکام والی احادیث کی تدوین کی طرف خاص توجہ رکھی ہے۔ کہیں کہیں پر مشکل الفاظ کے معنی بھی بیان کر دیتے ہیں، حدیث کی سند یا متن میں کوئی شبہ ہوتا ہے تو اسے بیان کرتے ہیں۔ کسی موضوع پر پہلے صحیح حدیث پیش کرتے ہیں، اگر صحیح حدیث نہ مل سکے تو پھر کم درجے کی حدیث پیش کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ اس کے ضعف کو بیان کر دیتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی شرائط بہت سخت رکھی تھیں، جن کو دیکھ کر محدثین کی ایک جماعت نے ان کی شرائط کو بخاری و مسلم کی شرائط سے بھی سخت قرار دیا تھا، مگر ان کی اس کتاب میں صحیح حدیثوں کے ساتھ ساتھ کمتر درجے کی اور کمزور حدیثیں بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

اس کی روایات تین قسم کی ہیں:

(۱) وہ روایات جو بخاری اور مسلم میں ہیں۔

(۲) وہ روایات جو بخاری اور مسلم کی شرائط کے مطابق ہیں۔

(۳) وہ روایات جن کو خود امام نسائی نے پیش کیا ہے اور اگر ان میں کوئی علت تھی تو اسے بیان کیا ہے۔

سنن نسائی کی شروح و حواشی صحاح ستہ کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں کم لکھی گئی ہیں، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں زیادہ تر وہی حدیثیں ہیں جو دوسری کتب صحاح میں آ چکی تھیں اور ان کی تشریح و توضیح متعدد بار ہو چکی تھی۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے توجہ کی اور شرحیں لکھی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

۱- الامعان فی شرح سنن النسائیؒ: اس کے مُصنّف علّامہ ابوالحسن علی بن عبداللہ (۵۶۷ھ) ہیں، غالباً یہ سنن نسائیؒ کی پہلی شرح تھی یہ بہت تفصیلی انداز پر کی گئی ہے۔ بہت سے مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲- شرح ابن الملقن: اس کے مصنف عمر بن علی بن محمد (۸۰۴ھ) ہیں، انھوں نے سنن نسائیؒ کی ان احادیث کی شرح کی ہے جو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد میں نہیں ہیں۔

۳- زہر الربی علی المجتبیٰ: اس کے مصنف علامہ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) ہیں۔ یہ شرح بہت مشہور ہے اور سنن نسائیؒ کے حاشیے پر شائع ہوئی ہے۔

۴- ایک اور حاشیہ محمد بن عبدالہادی سندھی (۱۱۸۲ھ) کا ہے، یہ سیوطی کے حاشیے سے زیادہ مفصل ہے اور اس میں متن کے مشکل مقامات کا حل، مشکل الفاظ کی شرح اور اعراب وغیرہ کی تحقیق کی گئی ہے۔[۱]

اس کے علاوہ بھی ہندستان کے بعض علمار نے کچھ شرحیں اور حواشی لکھے ہیں جن میں مولانا محمد زکریا کا کام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

---

[۱] محدثین عظام ص ۲۲۴

امام ابن ماجہؒ

ولادت ۲۰۹ھ۔ وفات ۲۷۳ھ

ان کا نام محمد، کنیت ابوعبداللہ اور لقب ابن ماجہ ہے۔ قزوین میں آپ کی پیدائش ہوئی اس لیے قزوینی بھی کہے جاتے ہیں۔ سلسلۂ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے۔ ابوعبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ۔ لفظ ماجہ کے بارے میں خاصا اختلاف ہے، کچھ لوگوں نے اسے آپ کی والدہ کا نام اور کچھ نے دادا کا نام بتایا ہے، لیکن بعد میں تحقیق کرنے والوں نے لکھا ہے کہ یہ آپ کے والد کا لقب تھا، شاہ عبدالعزیزؒ نے ماجہ کی نسبت ان کی ماں کی طرف کی ہے لیکن عجالۂ نافعہ میں لکھتے ہیں:

"ماجہ ان کے والد کا لقب ہے دادا کا نہیں اور

---

[۱] بستان المحدثین ص ۱۹۰

ماں کا نام بھی نہیں ہے...... اور اس کے متعلق
بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں"۔ [1]

ماجہ "ماہ" یا "ماہچہ" کا معرب ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابن ماجہ عجمی النسل ہیں لیکن ان کے عرب کے مشہور قبیلے ربیعہ سے گہرے دوستانہ مراسم تھے جس کی وجہ سے "ربعی" بھی کہے جاتے ہیں۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا تو جس قبیلے کے کسی شخص سے دوستانہ تعلقات پیدا کرتا اس قبیلے کی طرف منسوب ہو جاتا۔ چونکہ عام تاریخوں میں ان کے سلسلۂ نسب میں صرف والد کا ذکر آتا ہے اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے والد نے ربیعہ قبیلے کے کسی فرد سے پیمانِ وفا باندھا ہوگا۔ اسی لیے ربعی مشہور ہوئے۔ [2]

ان کے بچپن کا زمانہ علم وفن کے دور دورہ کا تھا' عباسی خلافت اپنے عروج پر تھی۔ بڑے بڑے اہلِ علم اور باکمال دربار کی سرپرستی میں علوم وفنون کو آگے بڑھا رہے تھے۔ امام صاحب کی زندگی کے زیادہ تر حالات کا پتا نہیں چلتا لیکن لوگوں نے قیاس سے لکھا ہے کہ زمانے کے دستور کے مطابق بچپن ہی سے تعلیم کی ابتدا کی ہوگی، ابتدائی تعلیم کے بعد حدیث سے دل چسپی ہونے کے سبب ادھر توجہ کی ہوگی۔ تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں قزوین میں کئی اہم محدثین موجود تھے اور ان کی مجالس درس میں لوگ بکثرت شریک ہوتے تھے۔

---

[1] بستان المحدثین، ص ۲۸ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن ماجہ اور علم حدیث، ص ۳ تا ۴

غالباً انھی بزرگوں سے اپنے ابتدائی دور میں امام صاحب بھی مستفید ہوئے ہوں گے اور پھر زمانے کے دستور کے مطابق تحصیل علم اور تکمیلِ فن کے لیے دوسرے شہروں اور ملکوں کے سفر کیے ہوں گے۔ بعض لوگوں نے ان کے شیوخ کی تعداد تین سو سے زائد لکھی ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: محمد بن ابی خالد' ابوبکر قزوینی' ہارون بن موسیٰ بن حیان تمیمی' عمرو بن رافع ابوحجر بجلی' ابوبکر بن ابی شیبہ جبارہ بن مغلس' سہل بن اسحاق' حمدون بن عمارہ' عبداللہ بن معاویہ' محمد بن سعید' ہشام بن عمار وغیرہ۔

امام صاحب مختلف شہروں سے کسبِ فیض کے بعد اپنے وطن قزوین واپس ہو گئے تھے اور وہیں درس وتدریس اور علم حدیث کی نشر و اشاعت میں زندگی گزار دی۔ جس طرح سے ان کے اساتذہ وشیوخ کی فہرست طویل ہے اسی طرح سے ان کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن دینار' احمد بن ابراہیم قزوینی' اسحاق بن محمد قزوینی' ابوبکر حامد ابہری' ابوالحسن بن قطان' سلیمان یزید' ابوجعفر محمد بن عیسیٰ وغیرہ۔ امام صاحب کی وفات چونسٹھ (۶۴) سال کی عمر میں ۲۷۳ھ میں ہوئی۔

امام صاحب کا دور حدیث کی تدوین وترویج کا دور تھا۔ اسی لیے قدرتی طور پر ان کو بھی اس فن سے دل چسپی ہوئی اور بہت جلد اس فن کے اکابر میں شمار کیے گئے۔ ان کی جلالتِ شان' وسعتِ نظر' ثقاہت اور حفظ حدیث کے بہت سے علماء معترف ہیں: حافظ ابویعلی خلیلی فرماتے ہیں کہ وہ ایک بلند پایہ معتبر اور لائق حجت محدث

تھے ان کی عظمت و ثقاہت پر اتفاق ہے، ان کو فنِ حدیث سے پوری واقفیت تھی اور وہ اس کے جلیل القدر حافظ تھے۔ ابوالقاسم رافعی نے لکھا ہے کہ ائمہ مسلمین میں ابن ماجہ بھی ایک بڑے معتبر امام ہیں ان کی قبولیت پر سب کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن جوزی کہتے ہیں کہ وہ حدیث و تاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے۔ علامہ ابن خلکان نے بیان کیا ہے کہ وہ فنِ حدیث کے امام اور اس کے متعلقات پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ ابن ماجہ عظیم الشان حافظ و ضابط صادق القول اور وسیع العلم تھے۔ علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ وہ ذی عقل، صاحبِ علم اور امام حدیث تھے، جمال الدین ابوالمحاسن بردی کہتے ہیں کہ ابن ماجہ امام، حافظ، حجت اور ناقدِ حدیث تھے۔ ان کو متعدد فنوں میں مہارت حاصل تھی، علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ وہ صاحبِ سنن، حافظِ حدیث اور امامِ فن تھے۔[1]

امام ابن ماجہ کی تین اہم اور مشہور تصانیف ہیں:

۱۔ تفسیر اس تفسیر کے متعلق حافظ عماد الدین ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "ابن ماجہ کی ایک جامع و ضخیم تفسیر ہے"۔ اس میں امام صاحب نے تفسیری احادیث و اقوال صحابہ و تابعین سند کے ساتھ جمع کیے ہیں۔ علامہ سیوطی نے اس تفسیر کا تذکرہ کیا ہے۔[2] اب اس کا پتا نہیں چلتا۔

---

[1] ملاحظہ ہو ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۲۴، ۱۲۵ و تذکرۃ المحدثین ص ۲۶۷، ۲۶۸

[2] ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۲۵، ۱۲۶

۲۔ تاریخ امام صاحب کو تاریخ سے بہت دل چسپی تھی، یہ تصنیف اسی دل چسپی کا ثبوت ہے، ان کی اس تاریخ کا نام بعض لوگوں نے "تاریخِ کامل" اور بعض نے "تاریخ ملیح" لکھا ہے۔ اس کا ایک نسخہ قزوین میں حافظ ابن طاہر مقدسی نے دیکھا تھا، اس میں صحابہ کے دور سے لے کر مصنف کے زمانے تک کی تاریخ اور خاص طور سے راویانِ حدیث کے حالات ہیں۔ چونکہ محدّث کے لیے تاریخِ رجال سے پوری واقفیت ضروری تھی غالباً ابن ماجہ نے اسی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر اس تاریخ کو مرتب کیا تھا۔ افسوس ہے کہ تفسیر کی طرح یہ تاریخ بھی نہیں ملتی ہے۔

۳۔ سنن یہ امام ابن ماجہ کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے اور اسی کی وجہ سے ان کی شہرت و عزت اور اہمیت میں بہت اضافہ ہوا۔ حدیث کی مشہور چھ کتابوں میں اس کو آخری نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ بہت سے مدارس میں اسے درسی کتابوں میں شامل رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں امام ابوزرعہ فرماتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تو حدیث کی موجودہ تصنیفات یا ان میں سے اکثر معطل ہو کر رہ جائیں گی۔ تاریخ قزوین میں ابوالقاسم امام الدین عبدالکریم لکھتے ہیں حفاظ حدیث امام ماجہ کی کتاب کو صحیحین، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے برابر رکھتے ہیں اور اس کی روایات سے حجت کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں:

"یہ کتاب امام ابن ماجہ کے علم و تبحر، اطلاع اور اصول و

فروع میں ان کی اتباع سنت کو بتاتی ہے"۔[1]

اس کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بہت سی ایسی احادیث بیان کی گئی ہیں جو صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ترتیب کی بھی علماء نے تحسین کی ہے، اس کی انھی دونوں خوبیوں کی وجہ سے علماء نے اس کا شمار صحاح ستہ میں کیا ہے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلے سنن ابن ماجہ کو حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی (۵۰۷ھ) نے صحاح ستہ میں شامل کیا۔[2] اگرچہ سنن ابن ماجہ کو آخری درجے پر رکھا گیا ہے لیکن اس میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دوسری کتب صحاح میں نہیں ہیں۔ مثلاً اس میں بہت سی احادیث دوسری کتابوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں جس ترتیب کے ساتھ ساتھ اس کی تبویب بھی حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں بہتر سمجھی جاتی ہے، اس میں حدیثوں کو ابواب کے اندر بلا تکرار اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ:

"ترتیب کی خوبی اور بغیر کسی تکرار کے احادیث کا لے آنا اور اختصار جو یہ کتاب رکھتی ہے کوئی کتاب نہیں رکھتی"۔[3]

حافظ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ "اس مفید ترین کتاب کی تبویب

---

[1] بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث، صـ ۱۲۸ [2] بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث، صـ ۲۳۳

[3] بستان المحدثین، صـ ۱۱۲

فقہی اعتبار سے نہایت عمدہ ہے"۔ اختصار اور عدم تکرار کے باوجود اس کی جامعیت مسلّم ہے، اس میں معلومات اور مسائل دوسری کتابوں سے زیادہ ہیں۔ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "ابن ماجہ کی کتاب سنن و احکام کی حیثیت سے بہت عمدہ اور جامع ہے"۔[1] اس کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پانچ ثلاثی روایتیں[2] ہیں۔ ابن ماجہ کی سنن کو صحیح بخاری کے سوا تمام دوسری کتب صحاح پر اس خصوصیت میں فوقیت حاصل ہے۔ بخاری میں ایسی بائیس (۲۲) روایات ہیں۔ ابن ماجہ میں پانچ (۵) ابوداؤد اور ترمذی میں ایک ایک ہے، مسلم اور نسائی میں ایک بھی نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے ابن ماجہ کی سنن کے بجائے امام مالک کی مؤطا کو کتب صحاح میں شامل کیا ہے اور بعض نے دارمی (متوفی ۲۵۵ھ) کی سنن کو، لیکن جمہور کی نظر میں صحاح ستہ میں شمولیت کی سعادت صرف ابن ماجہ کی سنن کو مل سکی اور علماء و محدثین کی ایک بہت بڑی تعداد نے ہمیشہ اسے کتب صحاح ستہ میں شامل رکھا ہے۔[3] البتہ یہ بات درست ہے کہ اس میں بہت سی ضعیف روایات موجود ہیں، بعد کے محدثین نے ان کی کمزوریوں کی طرف اشارے کیے ہیں اور

---

[1] بحوالہ تذکرۃ المحدثین، ج ۱، صـ ۲۷۲

[2] ایسی حدیثیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف تین واسطے ہوں۔

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ المحدثین، ج ۱، صـ ۲۷۳ تا ۲۷۸ اور ابن ماجہ اور علم حدیث صـ ۲۳۸ تا ۲۴۳

راویوں پر بحث کر کے ان کے ضعف کو بیان کیا ہے، لیکن اس سے اس کتاب کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی، اس لیے کہ جس طرح سے امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے بزرگوں نے محنت وجانفشانی سے اپنی کتابوں کو مدون ومرتب کیا تھا۔ انھوں نے بھی اسی انداز پر اور ویسی ہی محنت شاقہ سے حدیثوں کی جمع وتدوین کی اور جس طرح سے مندرجہ بالا بزرگوں کی کتابوں میں کمزور درجے کی روایات شامل ہوگئی ہیں اسی طرح سے اس میں بھی ہوا، فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں دوسری کتابوں کے مقابلے میں ایسی روایات کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کو کتبِ صحاح میں آخری درجے پر رکھا گیا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں ایک ہزار پانچ سو (۱۵۰۰) ابواب ہیں اور اس میں چار ہزار حدیثیں بیان کی گئی ہیں۔ امام صاحب سے ان کی سنن کو ان کے متعدد شاگردوں نے روایت کیا ہے ان میں سے چار زیادہ مشہور ہیں:

(۱) ابوالحسن بن قطان (۲) سلیمان بن یزید
(۳) ابوجعفر محمد بن عیسیٰ (۴) ابوبکر حامد ابہری

حافظ ابن حجر عسقلانی نے سعدون اور ابراہیم بن دینار کے ناموں کا اس فہرست میں اور اضافہ کیا ہے۔[1] ان سب میں ابوالحسن قطان کی روایت کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ یہ خود بہت بڑے عالم اور حافظِ حدیث

[1] تہذیب التہذیب، ج ۹، ص ۵۳۲

تھے، بڑے عابد وزاہد تھے، تاریخوں میں لکھا ہے کہ تیس سال تک صائم الدھر رہے، افطار میں صرف روٹی اور نمک استعمال کرتے تھے۔ حدیثوں کی تلاش وجستجو میں بڑی دور دور کے سفر کیے اور بڑی تعداد میں حدیثیں جمع کیں، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ایک لاکھ حدیثیں حفظ تھیں۔ عمر کے آخری حصے میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے، کہا کرتے تھے کہ یہ مجھے کثرتِ کلام کی سزا ملی ہے۔ ان کی ولادت ۲۵۴ھ میں اور وفات ۳۴۵ھ میں ہوئی۔

سنن ابن ماجہ پر بڑے بڑے اہلِ علم اور فنِ حدیث کے ماہرین اور حفاظ نے شروح وحواشی لکھے، ان کی تعداد سنن نسائی کے شروح وحواشی سے زیادہ ہے ان میں سے چند قابلِ ذکر درج ذیل ہیں:

۱۔ شرح سنن ابن ماجہ: حافظ علاء الدین مغلطائی (۷۶۲ھ) یہ سب سے پہلی شرح ہے جو بہت ہی جامع انداز پر لکھی جارہی تھی مگر مکمل نہ ہوسکی۔ اس کی شرح وبسط کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے ایک حصے کی شرح پانچ جلدوں میں ہے، اس کا قلمی نسخہ ٹونک کے کتب خانے میں تھا۔

۲۔ شرح سنن ابن ماجہ: ابن رجب زبیری، یہ کتاب نہیں ملتی ہے، لیکن اس کا ذکر شیخ ابوالحسن سندی نے اپنے حواشی میں کیا ہے۔

۳۔ ماتمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ: شیخ سراج الدین عمر بن علی بن

کتابیات

١۔ بستان المحدثین — شاہ عبدالعزیز دہلوی
٢۔ سیرۃ النعمان — علامہ شبلی نعمانی
٣۔ حیاتِ مالک — سید سلیمان ندوی
۴۔ تدوینِ حدیث — سید مناظر احسن گیلانی
۵۔ تذکرۃ المحدثین — مولانا ضیاء الدین اصلاحی
٦۔ تذکرۃ المحدثین — غلام رسول سعیدی
٧۔ محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے — تقی الدین ندوی
٨۔ مقامِ حدیث — مولوی محمد علی
٩۔ علوم الحدیث — شاہ محمد عز الدین پھلواروی
١٠۔ ترجمہ تحریر بخاری — مترجم: سید عبدالدائم جلالی
١١۔ امام اعظم ابو حنیفہ — مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری
١٢۔ حدیث کا تعارف — محمد فاروق خان
١٣۔ امام اعظم اور علم الحدیث — محمد علی صدیقی کاندھلوی
١۴۔ ابن ماجہ اور علم حدیث — عبدالرشید نعمانی
١۵۔ حدیثِ نبوی کے اولین صحیفے — مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی
١٦۔ امام احمد بن حنبل — نائب حسین نقوی
١٧۔ کلامِ نبوت — محمد فاروق خان
١٨۔ [illegible] (ترجمہ: بستان المحدثین) — عبد [illegible]
١٩۔ بشیر القاری — سید غلام جیلانی
٢٠۔ مقدمہ معارف المشکوٰۃ — مولانا سید عبدالرؤف
٢١۔ نصرت الحدیث — مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
٢٢۔ فن اسماء الرجال — تقی الدین ندوی
٢٣۔ انوارِ حدیث — سید محمد ہاشم شمسی
٢۴۔ مآثر و معارف — قاضی اطہر مبارکپوری
٢۵۔ خطبات مدراس — علامہ سید سلیمان ندوی
٢٦۔ حجۃ اللہ البالغۃ — شاہ ولی اللہ (اُردو ترجمہ: مولانا عبدالرحیم)
٢٧۔ انتخاب الترغیب والترہیب — زکی الدین منذری (اُردو ترجمہ: مولوی محمد عبداللہ دہلوی)
٢٨۔ تذکرۃ الحفاظ — حافظ عبداللہ شمس الدین ذہبی
٢٩۔ تہذیب التہذیب — ابن حجر عسقلانی
٣٠۔ مقدمہ شرح مسلم — یحییٰ بن شرف النووی
٣١۔ توجیہ النظر — طاہر بن صلاح الجزائری الدمشقی
٣٢۔ تاریخ بغداد — ابوبکر خطیب بغدادی
٣٣۔ حلیۃ الاولیاء — حافظ ابو نعیم احمد بن عبداللہ
٣۴۔ اختصار علوم الحدیث — ابن کثیر
٣۵۔ معرفۃ علوم الحدیث — حاکم نیشاپوری

کتابیں

	کتاب	مصنف
۳۷	الراوی	علامہ سیوطی
۳۸	علوم الحدیث	ابی عمرو بن صلاح
۳۹	الاستیعاب	ابن عبد البر
۴۰	اسد الغابہ	ابن الاثیر
۴۱	لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی
۴۲	الاصابہ	ابن حجر عسقلانی
۴۳	طبقات	ابن سعد الواقدی
۴۴	تاریخ کبیر	امام بخاری
۴۵	میزان الاعتدال	علامہ ذہبی
۴۶	تاریخ الاسلام (تاریخ کبیر)	علامہ ذہبی
۴۷	الجرح والتعدیل	حاتم رازی
۴۸	طبقات الحفاظ	علامہ سیوطی
۴۹	ابن حنبل	محمد ابو زہرہ
۵۰	السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی	مصطفیٰ سباعی
۵۱	قواعد التحدیث	سید جمال الدین قاسمی
۵۲	الباعث الحثیث (شرح اختصار علوم الحدیث)	احمد محمد شاکر
۵۳	شرح نخبۃ الفکر	ابن حجر
۵۴	فتح المغیث	السخاوی
۵۵	مسلمان اور وقت کے تقاضے	مولانا عبد السلام قدوائی ندوی